مجلہ عدالتی نظائر

اردو زبان میں عدالتی نظائر کی تلخیص پر مشتمل

آئین و قانون کی دنیا کا پہلا مجلہ

سرپرست	مدیر اعلی
محمد ذوالقرنین	مدثر اقبال
مشیر	مشیر
سلمان احمد مان	سجاد حمید یوسفزئی

شمارہ ۳، جنوری - مارچ ۲۰۲۴

برقی ویب گاہ: https://courtingthelaw.com/

"مجلہ عدالتی نظائر "آئین پاکستان اور اسلامی شریعت کی قائم کردہ مثالوں پر یقین رکھتا ہے۔ تاہم اس مجلہ میں شائع ہونے والے تمام افکار اہل قلم شرکاء کی ذاتی رائے ہیں۔ اس مجلہ کا ان سے کلی اتفاق ضروری نہیں۔

مجلہ عدالتی نظائر درج ذیل عدالتوں کے تمام موضوعات کے متعلق فیصلوں کے اردو میں ترجمے / تلخیص کا خیر مقدم کرتی ہے۔

1) عدالت عظمی
2) وفاقی شرعی عدالت
3) عدالت عالیہ اسلام آباد
4) عدالت عالیہ پشاور
5) عدالت عالیہ لاہور
6) عدالت عالیہ بلوچستان
7) عدالت عالیہ سندھ
8) تمام ضلعی عدالتیں
9) مرکزی عدالت گلگت بلتستان
10) مرکزی عدالت آزاد جموں و کشمیر
11) خصوصی عدالتیں
12) وفاقی اور صوبائی محتسب
13) بین الاقوامی عدالتِ انصاف

جملہ حقوق محفوظ ہے۔ پیشگی تحریری اجازت کے بغیر مجلہ کے کسی حصہ کی کسی بھی قسم کی اشاعت قانونی اور اخلاقی جرم ہے۔

مجلہ عدالتی نظائر کے اگلے شمارے میں اپنی تلخیص شائع کرنے کے لئے اس میل پر اپنی تحقیق ارسال کرے۔

editor.majala@gmail.com

مجلہ عدالتی نظائر

جنوری-مارچ ۲۰۲۴ء

مجلس ادارت

سرپرست: محمد ذوالقرنین، ایڈووکیٹ وریسرچ افیسر کے۔پی بار کونسل

مدیر: محمد قمرالحق، ناظم، جامعہ محمدی شریف، چینوٹ

نائب مدیر: عاقب فاروق، طالب علم شعبہ قانون، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

شریک مدیر۳: افراسیاب خان، طالب علم شعبہ شریعہ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

مدیر اعلی: مدثر اقبال، طالب علم شعبہ قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شریک مدیر: محمد اسد، طالب علم شعبہ شریعہ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شریک مدیر۲: ریحان اللہ، طالب علم شعبہ شریعہ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

مجلس مشاورت

سجاد حمید یوسفزئی
ایڈووکیٹ ہائی کورٹ و شریک بانی آئین و قانون

سلمان احمد مان
ایڈووکیٹ عدالت عالیہ و بانی قانون دان

فہرست

شمار	عنوان	تلخیص نگار	صفحہ
	تلخیص نگاران		8
	اداریہ		9
	پیش گفتار	آصف محمود	10
	دیوانی فیصلے		
1	معاہدہ بیع و شراء یعنی خرید و فروخت کے معاہدے میں تعزیری شق یعنی فریقین کی طرف سے معاہدے میں ناکامی کی صورت میں عدالتوں کی جانب سے دعویٰ تعمیل مختص کے حوالے سے پشاور ہائی کورٹ کا ایک انتہائی اہم فیصلہ	محمد زوالقرنین	12
2	سپریم کورٹ پریکٹس اینڈ پروسیجر ایکٹ ۲۰۲۳ پر سپریم کورٹ کا تفصیلی فیصلہ	سجاد حمید یوسفزئی	15
3	پاکستانی خواتین کے افغان شوہروں اور پاکستانی شہریوں کی افغان بیویوں کو بغیر پاسپورٹ اور ویزا کے پاکستان اوریجن کارڈ دینے کے حوالے سے پشاور ہائی کورٹ کا ایک اہم فیصلہ	طاہر خان وزیر	18
4	میڈیکل کالجوں میں داخلوں کے حوالے سے ہدایات اور پی۔ایم ۔ڈی۔سی کے ذمہ داریوں کے حوالے سے سپریم کورٹ کے اہم فیصلہ	مدثر اقبال	21
5	سپریم کورٹ کے ہیومن رائٹس سیل کے حوالے سے سپریم کورٹ کا ایک اہم فیصلہ	محمد زوالقرنین	24

6	بینولنٹ فنڈ، سروس سینیفٹس اور نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹ وغیرہ کے ترکہ /وراثت میں شمار ہونے یا نہ ہونے کے حوالے سے سندھ ہائی کورٹ کا ایک اہم فیصلہ	محمد زوالقرنین	27
7	سپریم کورٹ کا وراثتی جائیداد میں فریق ثالث مفادات وجود میں آنے اور طویل مدت کے بعد وراثت کے حق کا دعوی کرنے کے متعلق ایک اہم فیصلہ	افراسیاب خان	31
8	حق شفعہ کے حوالے سے سپریم کورٹ کے جج، جسٹس قاضی فائز عیسیٰ کا ایک اہم فیصلہ	طاہر خان وزیر	33

انتخابات کے فیصلے

9	پی ٹی آئی انٹرا پارٹی الیکشنز اور بلے کے انتخابی نشان سے متعلق الیکشن کمیشن کے پہلے اہم آرڈر[مورخہ ۱۳ نومبر ۲۰۲۳] کا خلاصہ	محمد اسد	35
10	پی ٹی آئی کے پارٹی انتخابات و انتخابی نشان منسوخ کرنے سے متعلق الیکشن کمیشن کے دوسرے اہم آرڈر[مورخہ ۲۲ دسمبر، ۲۰۲۳]کا خلاصہ	محمد اسد	41
11	عدالتی اختیار سماعت، الیکشن کمیشن کے اختیارات اور پی ٹی آئی کے پارٹی انتخابات سے متعلق پشاور ہائی کورٹ کا فیصلہ	محمد اسد	44
12	تحریکِ انصاف کے انتخابی نشان سے متعلق سپریم کورٹ کے تین رکنی بینچ کا فیصلہ	قاسم اقبال جلالی	49

فوجداری فیصلے

13	اشتہاری ملزم کے انتخابات کے لئے اہل ہونے یا نہ ہونے کے حوالے سے سپریم کورٹ کا اہم فیصلہ	محمد زیشان حیات خان خٹک	55
14	دفعہ ۵۶۱- اے [مجموعہ ضابطہ فوجداری] اور آئین کے آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت ہائی کورٹ کے فوجداری اختیارات کے حوالے سے سپریم کورٹ کا فیصلہ	مدثر اقبال	57
15	منشیات کے کیسز میں ویڈیو گرافی کے حوالے سے سپریم کورٹ کا ایک انتہائی اہم فیصلہ	محمد ذوالقرنین	59
16	ایوان فیلڈ ریفرنس میں مریم نواز اور کیپٹن صفدر کی اپیلوں پر اور ان کو بری کرنے پر اسلام آباد ہائی کورٹ کا فیصلہ	قاسم اقبال جلالی	61
17	وکلاء سمیت مختلف پیشوں کے لبادے میں ہونے والے جرائم یعنی زاتی گاڑیوں مختلف نمبر پلیٹ لگا کر جرم کرنے کے حوالے سے پشاور ہائی کورٹ کا ایک اہم فیصلہ	محمد ذوالقرنین	67
18	سٹیپوٹری گراؤنڈ پر ضمانت کے حوالے سے سپریم کورٹ کا ایک انتہائی اہم اور تاریخ ساز فیصلہ	محمد ذوالقرنین	69
19	سپرداری کے متعلق سپریم کورٹ کا فیصلہ	ریاض احمد بٹ	71
20	راضی نامے کی بنیاد پر فوجداری مقدمے سے بری ہونے کے ، باعزت بری ہونے یا نہ ہونے کے حوالے سے لاہور ہائی کورٹ کا فیصلہ	محمد مخدوم شاہ	73
21	"میرانڈا" رول، دوران تفتیش اور ٹرائل مرضی کا وکیل کے حوالے سے لاہور ہائی کورٹ کا ایک اہم فیصلہ	طاہر خان وزیر	77

عائلی فیصلے

22	انتقال وراثت کی میعاد سماعت اور اصول رضامندی کے حوالے سے سپریم کورٹ کا ایک انتہائی اہم فیصلہ	محمد زوالقرنین	79
23	متبنی یعنی لے پالک کے حق حضانت سے متعلق لاہور ہائی کورٹ ملتان بنچ کا ایک اہم اور تاریخی نوعیت کا فیصلہ	اسامہ محمد خان	84
24	والد کے خلاف بچے کے حق میں نان نفقے کا فیصلہ ،کیا صرف والد کے خلاف ہی والد ہی خلاف قابل تنفیذ ہوگی یا دادا کے خلاف بھی قابل تنفیذ ہونے یا نہ ہونے کے حوالے سپریم کورٹ کا اہم فیصلہ	طاہر خان وزیر	88
25	تصور نان ونفقہ میں بچے کے تعلیمی اخراجات بھی شامل ہے،اس حوالے سے سپریم کورٹ کا ایک اہم فیصلہ	طاہر خان وزیر	90
26	بچے کے نان نفقہ میں سالانہ اضافے کا اطلاق بچے کی پیدائش ہوگا یا ڈگری پاس ہونے کے دن سے ہوگا، اس نکتہ پر لاہور ہائی کورٹ کا اہم فیصلہ	طاہر خان وزیر	92

مضامین

	پاکستان میں قانون کی تعلیم: ۵ سالہ اور ۳ سالہ ایل ایل۔بی کا ایک موازنہ	ڈاکٹر عزیز الرحمان	94

تلخیص نگاران

محمد ذوالقرنین

ایڈوکیٹ، پشاور بار ایسوسی ایشن و شریک بانی ٹیم آئین و قانون

سجاد حمید یوسفزئی

ایڈوکیٹ ہائی کورٹ و شریک بانی ٹیم آئین و قانون

طاہر خان وزیر

ایڈوکیٹ و ممبر ٹیم آئین قانون

مدثر اقبال

طالب علم شعبہ قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد و ممبر ٹیم آئین و قانون

افراسیاب خان

طالب علم شعبہ شریعہ و قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد و ممبر ٹیم آئین و قانون

محمد اسد

طالب علم شعبہ شریعہ و قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد و ممبر ٹیم آئین و قانون

قاسم اقبال جلالی

ایڈوکیٹ ہائی کورٹ

محمد زیشان حیات خان خٹک

ایڈووکیٹ، ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن نوشہرہ و ممبر ٹیم آئین و قانون

ریاض احمد بٹ

طالب علم شعبہ شریعہ و قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

محمد مخدوم شاہ

طالب علم شعبہ شریعہ و قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

اسامہ محمد خان

ایڈوکیٹ، پشاور بار ایسوسی ایشن

اداریہ

ایک وکیل کی بنیادی خصوصیت سچائی کی تلاش کے ساتھ ساتھ ثبوت کی فراہمی ہے اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ وسیع اور عمیق مطالعے کے بغیر سچائی کی تلاش اور ثبوت کا حصول ایک سعی لاحاصل کے سوا کچھ نہیں اور اس بات میں بھی کوئی دو رائے نہیں کہ مطالعہ کے بغیر کسی بھی شعبہ میں اوج کمال تک پہنچنا ناممکن ہے جبکہ شعبہ قانون اور بالخصوص وکالت میں مطالعے کی ضرورت باقی تمام شعبہ ہائے زندگی سے کہیں زیادہ ہے اور مطالعے میں بھی بالخصوص عدالتی نظائر کا مطالعہ شعبہ قانون سے تعلق رکھنے والے ہر فرد کے لئے بالکل لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ عدالتی نظائر کی اسی اہمیت کے پیش نظر القرنی لا ایسوسی ایٹس، آئین و قانون اور قانون دان نے جولائی ۲۰۲۳ سے پاکستان کی آئینی و قانونی تاریخ میں پہلی مرتبہ سہ ماہی بنیاد پر سلیس اور آسان اردو میں عدالتی نظائر کی تلخیص پر مشتمل مجلہ عدالتی نظائر کی اشاعت کا آغاز کیا ہے۔ یاد رہے کہ مجلہ عدالتی نظائر اس طویل المدت سوچ کی پہلی سیڑھی ہے کہ جس میں بالخصوص شعبہ قانون سے تعلق رکھنے والے احباب اور بالعموم عام عوام کی تمام ضروریات پر مشتمل قومی زبان اردو میں ایک مجلہ ہو۔ امید واثق ہے کہ مجلہ عدالتی نظائر کا علمی و ادبی معیار بہت جلد ملک پاکستان کے ممتاز مجلوں میں شمار ہو گا۔

پیش گفتار

یہ کسی بھی شہری کا ایک بنیادی انسانی حق ہے کہ اس کی ریاست اس کے لیے جو قانون بنائے وہ اس کی قومی زبان میں ہو اور اس قانون کے اطلاق کے لیے جو نظام انصاف وضع کیا جائے اس کی کارروائی اور اس کے فیصلوں کی زبان بھی وہی ہو۔

بد قسمتی سے پاکستان کا نظام قانون و انصاف نو آبادیاتی دور کی غلامی کی نفسیات کا اسیر بن کر رہ گیا ہے۔ چنانچہ وہ بنیادی حقیقت کو سمجھنے سے ہی قاصر ہے کہ نو آبادیاتی شعوری غلامی کے آزار سے باہر بھی ایک دنیا آباد کی جا سکتی ہے اور یہ کہ پاکستان کا آئین، قانون، اور نظام انصاف کی جملہ دستاویز پاکستان کی قومی زبان میں ہونی چاہییں۔

برطانیہ میں جب ایک متحدہ ریاست وجود میں آئی تو یہ طے کیا گیا کہ تمام بادشاہوں کی عدالتوں میں جو قانون رائج تھے ان کا جو حصہ سب کے ہاں مشترکہ یعنی کامن تھا وہ نئی ریاست کا قانون قرار پائے گا۔ اسی کو کامن لا کہا گیا۔ چنانچہ اسی اصول کی بنیاد پر کہا گیا کہ اب قانون سے لاعلمی کوئی عذر نہیں ہو گا۔

ہمارے ہاں کامن لا کا یہ اصول تو اٹھا لیا گیا کہ قانون سے لاعلمی کوئی عذر نہیں، لیکن ہمارا قانون اجنبی زبان میں ہے۔ اجنبی زبان میں قانون لکھ کر، اجنبی زبان میں ضابطے مرتب کر کے ہم نے عوام سے کہا کہ قانون سے لاعلمی کا بہانہ نہیں چلے گا۔ سوال یہ ہے کہ کیا انسانی حقوق سے اس سے کریہہ پامالی بھی کوئی ہو سکتی ہے؟

زبان تو کیا ہم ان بنیادی رسوم سے بھی باہر نہیں نکل سکے جو نو آبادیاتی دور غلامی میں ہم پر مسلط کی گئیں۔ ہمارے وکلا پاکستان کی گرمی میں آلودہ ماحول میں وہ سیاہ لباس پہنتے ہیں جو ایک زمانے میں برطانیہ میں کوئین میری دوم کے انتقال پر سوگ میں پہنا گیا تھا۔ ہمارے جج حضرات وہ لباس پہنتے ہیں جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے جج صاحبان پہنتے تھے اور جس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی نے برصغیر کے قاضیوں کے لباس کی تضحیک کے طور پر یہ لباس خدام کو پہنایا ہمارے ہاں آج بھی جناح کیپ اور شیروانی صرف ججوں کے پیچھے کھڑے خدام ادب کو پہنائی جاتی ہے۔

ہماری ساری جورسپروڈنس آج بھی نو آبادیاتی غلامی والی ہے۔ کہنے کو ریاست کا مملکتی مذہب اسلام ہے لیکن قانون کی شرح میں شاید ہی کبھی اس نکتے پر غور ہوا کہ اسلام کا نظم اجتماعی اور اسلام کی جورسپراڈنس اس بارے کیا کہتے ہیں۔ اس نو آبادیاتی غلامی کی گرفت سے نکلنا بہت ضروری ہے۔ ہمارا آئین، ہمارا قانون اور ہمارے عدالتی فیصلے سب کی زبان اردو ہونی چاہیے۔

اس نظام سے مستفید ہونے والے طبقات شاید یہ خطرہ محسوس کرتے ہیں کہ سب کچھ اردو میں ہو گیا تو ان کی وہ بالادستی ختم ہو جائے گی جو علم و دانش کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایک اجنبی زبان کے ناقص علم کی بنیاد پر ہے۔ انگریزی کی بنیاد پر یعنی صرف زبان کی بنیاد پر ہمارے ملک میں طبقاتی تقسیم پیدا کی جا چکی ہے جس کی آئین پاکستان بھی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن کیا کریں کہ آئین پاکستان کی اپنی زبان انگریزی ہے اور آئین سازوں نے یہ بات بھی انگریزی میں لکھ رکھی ہے کہ ملک کی قومی زبان اردو ہو گی۔

پاکستان کے نظام قانون و انصاف میں اصلاح کے لیے ناگزیر ہے کہ نوآبادیاتی باقیات کا خاتمہ کیا جائے، اور ردعمل کی نفسیات کے اسیر ہوئے بغیر اپنے قوانین اپنی زبان مین اپنے فہم اور اپنے فلسفہ قانون کے مطابق مرتب کیے جائیں۔ یہ ایک طویل عمل ہے۔ کٹھن بھی ہے لیکن کرنے کا کام یہی ہے۔ مجلہ عدالتی نظائر اسی سلسلے کی ایک قابل تحسین کڑی ہے۔ جو کام ریاست اور پارلیمان کو کرنا چاہیے تھا وہ کام محمد ذوالقرنین ایڈووکیٹ، مدثر اقبال اور سجاد حمید یوسف زئی، سلمان احمد مان ایڈوکیٹ جیسے نوجوان کر رہے ہیں۔ یہ وہی معاملہ ہے جس کی خواہش اقبال نے کی تھی: جوانوں کو پیروں کا استاد کر۔

پاکستان کا نظام قانون کبھی ڈی کالونائز ہوا اور ہم نے اپنا قانون اپنے آئینی زبان میں بنایا اور ہمارے عدالتے فیصلے اردو میں ہی لکھے جانے لگے تو مجلہ عدالتی نظائر کا شمار اس صبح نو کے اولین نقوش میں ہو گا۔

آصف محمود

ماہر قانون و کالم نگار

دیوانی فیصلے

معاہدہ بیع و شراء یعنی خرید و فروخت کے معاہدے میں تعزیری شق یعنی فریقین کی طرف سے معاہدے میں ناکامی کی صورت میں عدالتوں کی جانب سے دعویٰ تعمیل مختص کے حوالے سے پشاور ہائی کورٹ کا ایک انتہائی اہم فیصلہ[1]

محمد ذوالقرنین[2]

کیس کے حقائق:

۷جولائی ۱۹۹۳ کو صلاح الدین نامی مدعی نے اپنا آٹھ مرلے کا گھر ۴ لاکھ ۷۰ہزار روپے کے عوض معاہدہ بیع و شراء کے مطابق محمد بشیر نامی مدعا علیہ کو فروخت کر دیا اور محمد بشیر نے موقع پر ہی مدعی یعنی صلاح الدین کو دو لاکھ بیس ہزار روپے ادا کئے جس کے بدلے میں مدعی نے گھر کا قبضہ مدعا علیہ کو دیا اور یوں مدعا علیہ ۱۹۹۳ میں ہی گھر منتقل ہوگیا۔ یہاں پر یاد رہے کہ بقیہ پیسوں کے بارے میں کہا گیا کہ چونکہ مدعی نے یہ گھر پہلے سے ہی ہاؤس بلڈنگ فائنانس کارپوریشن کے پاس رہن کے طور پر گروی رکھا ہوا تھا تو وہ یعنی صلاح الدین پہلے اس رہن کو ختم کرے گا جس کے بعد محمد بشیر بقیہ پیسوں کی ادائیگی کرے گا اور پھر صلاح الدین پر لازم ہوگا کہ وہ کاغذات میں بھی اس گھر کو محمد بشیر کے نام منتقل کرے گا۔ فریقین کے درمیان معاہدہ بیع و شراء یعنی مندرجہ بالا معاہدے میں ایک تعزیری شق بھی رکھی گئی تھی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر مدعی کی طرف سے معاہدہ تکمیل تک نہیں پہنچتا تو مدعی یعنی صلاح الدین ، مدعا علیہ یعنی محمد بشیر کو جرمانے کے طور پر چار لاکھ چالیس ہزار روپے ادا کرے گا اور اگر مدعا علیہ

---

[1] یہ انتہائی اہم فیصلہ عدالت عالیہ پشاور کے جج ، جسٹس اعجاز انور صاحب نے لکھا ہے اور اس کو سول ریویژن نمبر ۳۶۳- پی آف ۲۰۱۲ پر پڑھا اور دیکھا جا سکتا ہے۔

[2] ایڈوکیٹ، پشاور ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن و شریک بانی ٹیم آئین و قانون اور ان کو zulqarnain4783@gmail.com کے ذریعے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

کی طرف سے معاہدے کی پاسداری نہیں کے جائے گی تو دو لاکھ بیس ہزار روپے جو پہلے ہی ادا کئے گئے ہیں تو مدعی اس کو قبضہ کرنے میں حق بجانب ہوگا۔

مندرجہ بالا معاہدہ ، یہاں تک تو خرید و فروخت کے باقی معاملات کی طرح بظاہر ایک بہت واضح اور عام فہم معاہدہ تھا لیکن مسئلہ تب پیدا ہوا جب معاہدے کی تاریخ تکمیل یعنی ۶جولائی۱۹۹۴ گزرنے کے بعد مدعی یعنی صلاح الدین نے پشاور کے مقامی عدالت یعنی سول جج سے اس بابت رجوع کیا کہ چونکہ ۷جولائی۱۹۹۳ کو جو معاہدہ ہوا تھا تو اس میں بقیہ رقم کی ادائیگی کے جو وقت مقرر تھا تو وہ گزر چکا ہے تو اس لئے مدعا علیہ یعنی محمد بشیر پر لازم ہے کہ وہ نہ صرف وہ رقم ادا کرے بلکہ گھر کا قبضہ بھی واپس مدعی کے حوالے کرے لیکن یاد رہے کہ اس کے جواب میں محمد بشیر یعنی مدعا علیہ نے بھی دعویٰ تعمیل مختص دائر کیا اور عدالت سے یہ استدعا کی کہ مدعی پر لازم ہے کہ وہ گھر اس کے نام پر منتقل کرے بصورت دیگر وہ جرمانے کے طور پر چار لاکھ چالیس ہزار روپے ادا کرے۔ فریقین کی جانب سے سول جج کی عدالت میں ایک لمبے قانونی جنگ کا اختتام بالآخر ۲۰۱۰ میں مدعا علیہ یعنی محمد بشیر کی جیت پر کچھ ہوں ہوتا ہے کہ مکان اس کا نام پر منتقل کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا جاتا ہے اور اسی فیصلے کو مدعی کی جانب سے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج پشاور کے پاس اپیل میں بھی برقرار رکھا جاتا ہے۔

- **نوٹ :** یہاں پر یاد رہے کہ مقدمے کے یہاں تک پہنچنے کے دوران میں مدعی اور مدعا علیہ دونوں اپنی جان ، جان آفریں کے سپرد کر چکے ہوتے ہیں جس کے بعد دونوں کے ورثاء کے درمیان یہ قانونی جنگ چل رہی ہوتی ہے۔

سول جج اور ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج کی عدالت سے قانونی جنگ میں شکست کے بعد مدعی کی جانب سے عدالت عالیہ پشاور سے رویژن یعنی نگرانی درخواست کے تحت رجوع کرتا ہے اور یوں اس فیصلے کا آغاز ہوتا ہے۔

عدالت عالیہ پشاور نے فریقین کے وکلاء کے دلائل سننے کے بعد اپنے فیصلے کا آغاز اس نکتے سے کیا ہے کہ ۷جولائی۱۹۹۳ کو فریقین کے درمیان جو معاہدہ بیع و شراء ہوا تھا تو بنیادی طور پر وہ ایک مشروط معاہدہ تھا اور مشروط اس وجہ سے تھا کہ چونکہ مدعی کو پہلے اپنے گھر سے وہ ہاؤس بلڈنگ فائنانس کارپوریشن کی رہن ہٹانا تھی اور اس کے علاوہ بھی اس گھر پر نیشنل بینک آف

پاکستان کا قرضہ تھا تو وہ دونوں ہٹانے کے بعد ہی مدعی کے خلاف معاہدہ تعمیل مختص یعنی سپیسفک پرفارمینس کا فیصلہ ہو سکتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ مدعی کی جانب سے یہ دلائل دینا کہ مدعا علیہ نے بقیہ پیسوں کی ادائیگی نہیں کی تھی تو وہ اس لئے اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ مدعی نے خود بھی اپنے گھر سے رہن نہیں ہٹا پایا تھا تو اس لئے معاہدے میں ناکامی کا زیادہ قصور مدعی کا ہی ہے اور یہی وجہ کہ فریقین کی طرف سے معاہدے میں ناکامی کی صورت میں فریقین کے پاس حل صرف ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ فریقین نے خود معاہدے کی ناکامی کی صورت میں جو شق رکھی تھی تو اس کو عمل میں لانا تھا اور یہ بات مدعا علیہ یعنی محمد بشیر کے علم میں بھی تھی اور اسی وجہ سے اس نے دعویٰ تعمیل مختص میں ناکامی کی صورت میں بصورت دیگر جرمانے کی رقم یعنی چار لاکھ چالیس ہزار روپے مانگی تھی اور اسی حل کو عمل میں لاتے ہوئے عدالت عالیہ پشاور نے سول جج اور ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج کے فیصلوں کو کالعدم قرار دیتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ مدعی یعنی صلاح الدین کے ورثاء مدعا علیہ یعنی محمد بشیر کے ورثاء کو چار لاکھ چالیس ہزار روپے کی ادائیگی ۱۹۹۵سے بینک ریٹ پر سود سمیت ادا کریں گے اور مدعا علیہ کو یہ حکم دیا کہ وہ مدعی کو گھر واپس کرے۔

یاد رہے کہ عدالت عالیہ پشاور کی جانب سے یہ فیصلہ سامنے آنے کے بعد مدعا علیہ نے اس دورانیے میں گھر کی تعمیر و ترقی کے ضمن میں ۳۰ لاکھ روپے مانگے لیکن اس کو عدالت نے اس وجہ سے خارج کردیا کہ چونکہ وہ ۱۹۹۴ سے ہی گھر میں رہائش پذیر ہے تو یہ بذات خود بہت مدعا علیہ کے لئے بڑا فائدہ تھا۔

خلاصہ:

اس اہم فیصلے کا خلاصہ یہ ہے کہ معاہدہ بیع و شراء میں جب تعزیری شق ہوگی تو عدالتوں پر لازم ہوگا کہ فریقین کے درمیان اس شق کے مطابق ہی جرمانے وغیرہ کا فیصلہ کریں گی نا کہ عدالتیں خود فریقین کے درمیان کسی معاہدے کا موجب بنیں گی۔

سپریم کورٹ پریکٹس اینڈ پروسیجر ایکٹ ۲۰۲۳ پر سپریم کورٹ کا تفصیلی فیصلہ[3]

سجاد حمید یوسفزئی[4]

کیس کے حقائق:

مقننہ نے سپریم کورٹ پریکٹس اینڈ پروسیجر بل کے نام سے ایک قانون بنانا چاہا۔ جس پہ سپریم کورٹ کے ابتدائی بنچ جو کہ ۸ ججز پر مشتمل تھا، نے اسے قانون بننے سے قبل ہی ۱۳اپریل ۲۰۲۳کو مختصر حکم نامے کے ذریعے زریعے معطل کیا۔ بعد میں یہ بل، قانون بنا مگر اس پہ بھی ابتدائی بنچ کی طرف سے حکم امتناعی جاری ہوا۔ اس کیس کی بعد میں کئی سماعتیں ہوئی مگر حکم امتناعی برقرار رہا اور ابتدائی بنچ نے اس پہ تفصیلی سماعت نہیں کی۔

۱۷ستمبر ۲۰۲۳ کو جب پاکستان کے نئے چیف جسٹس قاضی فائزعیسی نے حلف لیا تو اگلے دن سب سے پہلے اسی قانون کا فیصلہ کرنے کے لیے فل کورٹ تشکیل دی جو کہ ۱۵ ججز پر مشتمل تھی۔ فل کورٹ تشکیل دینے کا مطالبہ کچھ درخواست گزاروں/فریقین کا بھی تھا۔

فیصلہ :

فل کورٹ کا حکم ۵/۱۰ کے تناسب سے آیا جس میں دس ججز نے اس ایکٹ کو آئین کے مطابق مانا اور پانچ نے متصادم مانا ہے۔

۶/۹ کی اکثریت سے اس ایکٹ کے دفعہ ۵ کو جو کہ مستقبل میں اپیل کا حق دیتا ہے کو بھی آئین کے مطابق مانا گیا۔ ۶ ججز نے اس سے اختلاف کیا ہے۔

۸/۷ کی اکثریت سے اس ایکٹ کے دفعہ ۵ کی ذیلی شق ۲ کو آئین سے متصادم مانا گیا جو کہ اپیل کا حق موثر بہ ماضی کرتا ہے۔ ۷ ججز نے اس سے اختلاف کیا ہے۔

ابتدائی آٹھ ججز بنچ نے اس قانون کے خلاف اس بنیاد پہ حکم امتناعی جاری کیا تھا کہ یہ عدالتی خودمختاری کے ساتھ صریح چھیڑ چھاڑ ہے جس کی اجازت آئین نہیں دیتا۔

---

[3]اس فیصلے کے مصنف جج چیف جسٹس آف پاکستان قاضی فائز عیسیٰ صاحب ہے اور اسے آئینی درخواست نمبر [پی ۶ آف ۲۰۲۳] کے تحت تلاش کیا جاسکتا ہے۔

[4]ایڈووکیٹ ہائی کورٹ و شریک بانی ٹیم آئین و قانون۔

درخواست گزاروں کے دلائل کا خلاصہ:

مذکورہ ایکٹ آئین کے آرٹیکلز ۱۰،۹،۴اور ۱۰اے سے متصادم ہے۔ یہ عدالتی خودمختاری میں چھید ہے۔ وفاقی قانون سازی کی لسٹ میں ایسی کوئی شق نہیں ہے جو پارلیمان کو یہ قانون بنانے کا اختیار دیتی ہو۔ یہ قانون بہت قریب سے سپریم کورٹ کے معاملات کو ریگولیٹ کرتاہے ۔

عدالت پھر اس ایکٹ کے تمام دفعات کا ذکر کرتا ہے اور قرار دیتا ہے کہ یہ قانون کسی صورت بھی آئین سے متصادم نہیں ہے۔ عدالت نے اس کے بعد آئینی سکیم کا جائزہ لیا اور کہا کہ آئین میں سپریم کورٹ کے لیے مختلف اختیار سماعت مذکور ہیں اور کوئی بھی جج ان اختیارات سماعت سے باہر نہیں نکل سکتا۔ قانون جو بھی اختیار سماعت دیتا ہے وہی ہونا چاہیے نہ اس سے زیادہ نہ کم۔سپریم کورٹ کا مطلب صرف چیف جسٹس نہیں بلکہ سپریم کورٹ کے تمام ججز ہیں۔آئین و قانون چیف جسٹس کو یک طرفہ طور پر علیحدہ اختیار نہیں دیتا جو کہ دیگر ججز کو حاصل نہیں ہے۔ چیف جسٹس کی رائے دیگر ججز کی رائے پر فوقیت نہیں رکھتی۔

ماسٹر آف روسٹر کاتصور آئین میں نہیں ہے۔ ماسٹر سے بڑا منفی اثر بھی نکلتا ہے۔ یہ لفظ تابعداری/بندگی لازم کرتا ہے جس کی انتہاء غلامی ہے۔ جس کی اجازت ہمارا آئین نہیں دیتا۔

اسلام مساوات کا درس دیتا ہے اور ہمارا آئین قرآن و حدیث سے ماوراء جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ ہمارے آئین کے ابتدائی الفاظ اللہ تعالی کے دو خوبصورت نام ہیں، الرحمان اور الرحیم۔ آئین کا ابتدائیہ مزید کہتا ہے کہ حکمرانی کا حق اللہ تعالی کو حاصل ہے اور یہ اختیار زمین پہ انسانوں کے پاس ایک مقدس امانت ہے۔ آئین صرف ایک ہی ذات کی تابعداری جائز کرتا ہے اور وہ ہے خالق کی تابعداری۔ بندگی یا غلامی ہمارے آئین کے بھی خلاف ہے۔ قرآن بھی کہتا ہے کہ اپنے معاملات مشاورت سے سرانجام دیں۔ معاملات میں مشاورت ضروری امر ہے۔

عدالت پھر اس آیت کی تشریح میں لگ جاتی ہے۔

سپریم کورٹ مزید کہتی ہے کہ تاریخ گواہ ہے کہ جب کبھی طاقت ایک ہی شخص میں جمع ہوگئی تو یہ تباہی و بربادی کا موجب بنا۔

عدالت اس کے بعد عدالتی نظیر کے تصور پہ تفصیلی گفتگو کرتی ہے اور قرار دیتی ہے کہ عدالتی نظائر کی اتباع ضروری ہے مگر اس کے اصل موجد، یعنی برطانیہ کے ججز اور قانونی ماہرین، بھی

مانتے ہیں کہ قانون عدالتی نظیر پہ فوقیت رکھتا ہے۔ اسی طرح برطانیہ میں ایک روایت یہ ڈالی گئی کہ کوئی نظیر اگر موجبِ ظلم یا نا انصافی بن رہا ہو تو اس سے انحراف ممکن ہوسکتا ہے یعنی عدالتی نظیر کے اس اصول کو بہت سختی کے ساتھ نہیں اپنایا جاسکتا۔

اس کے بعد عدالت ماسٹر آف روسٹر کا رواج بننے پہ بحث کرتی ہے۔ درخواست گزاروں کا کہنا تھا کہ یہ لفظ اب ہماری عدالتی نظائر کا ایک رواج بن گیا ہے جسے قانون کی حثیت حاصل ہوگئی ہے۔ عدالت پھر سے دیگر ممالک کے قوانین اور کتب کا حوالہ دیتی ہے کہ کسی عمل کا رواج بننا قانون بننا نہیں کھلاتا جب تک قانون اس رواج کو قانون نہ مان لے۔

عدالت آخر میں عدالتی خودمختاری کی تعریف دیتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ " عدالتی خودمختاری" کا مطلب یہ ہے کہ ججز سیاسی استحصال سے آزاد ہوں، وہ فریقین کے لیے غیر جانبدار ہوں، اور ان کا ایک عدالتی ادارہ ہو جس کے پاس بطور ادارہ یہ اختیار ہو کہ وہ حکومتی افعال کی جانچ پڑتال کر سکے، غیر جانبدار انصاف دے سکے اور اہم آئینی و قانونی اقدار کا فیصلہ کر سکے۔ "

آئین نے آرٹیکل ۱۹۱ کے تحت مقننہ کو یہ اختیار دیا ہے وہ سپریم کورٹ کے لیے بھی قانون سازی کرے۔ موجودہ قانون اس آرٹیکل کے تحت بنا ہے اور یہ آئین کے مطابق ہے۔

ایک اہم ترین نکتہ اس فیصلے کا یہ ہے کہ دنیا میں یہ عمل عام ہے کہ جہاں کوئی فریق متاثر ہو تو اسے اپیل کا حق دیا جائے۔ یہ ایکٹ یہی حق فراہم کرتا ہے۔ اسلام بھی متاثرہ فریق کو اپیل کا حق دیتا ہے اور ہمارا قانون، انفورسمنٹ آف شریعت ایکٹ ۱۹۹۱، کہتا ہے کہ جہاں کہیں دو تعبیرات ممکن ہوں تو تو وہی تعبیر اپنائی جائے گی جو شریعت کے قریب ہو۔ اپیل کا حق شریعت دیتا ہے اور یہ اس کے قریب تر بھی ہے۔ یہ بات دس ججز نے متفقہ طور پر کہی ہے۔

عدالت نے آخر میں مذکورہ قانون کو آئین کے مطابق قرار دیتے ہوئے تمام درخواستوں کو مسترد کر دیا۔

پاکستانی خواتین کے افغان شوہروں اور پاکستانی شہریوں کی افغان بیویوں کو بغیر پاسپورٹ اور ویزا کے پاکستان اوریجن کارڈ دینے کے حوالے سے پشاور ہائی کورٹ کا ایک اہم فیصلہ[5]

طاہر خان وزیر[6]

بنیادی سوال:

کیا نادرا کا پی ۔او۔ سی [پاکستان اوریجن کارڈ] کے اجراء کے لیے افغان شہریوں سے آفغانی پاسپورٹ اور ویزہ کا لگایا گیا شرط درست ہے؟

وکلاء کے دلائل:

ان پٹیشنز میں درخواست گزاروں [شوہر/بیوی] کا موقف تھا وہ پاکستان شہری کے ساتھ شادی شدہ ہونے کے بنا پر پاکستان اوریجن کارڈ کے حقدار ہے۔ ان کا انحصار نادرا آرڈننس، ۲۰۰۰ کے دفعہ ۱۱ اور نادرا [پاکستان اوریجن کارڈ رولز] کے رول چار پر تھا جس کے تحت اگر کوئی پاکستانی شہری سے شادی کرے تو اسے پاکستان اوریجن کارڈ مل جاتی ہے۔

نادرا اور حکومت کا موقف تھا کہ پاکستان اوریجن کارڈ کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ درخواست گزاروں کے پاس افغانی پاسپورٹ اور ویزہ ہونا لازم ہے۔ انڈیا اور افغانستان سے تعلق رکھنے والے ایسے افراد کو وزارت داخلہ کے ایک لیٹر کی بابت "کلاس بی" میں رکھا گیا ہے جن کی پاکستان اوریجن کارڈ حاصل کرنے کی درخواست کو سیکورٹی کلیئرنس سے مشروط کیا گیا ہے۔

عدالت کا فیصلہ:

فریقین کو سننے کے بعد عدالت اس کیس کو متعلقہ ملکی اور غیر ملکی قوانین اور عدالتی نظائر کے تناظر میں دیکھتی ہے۔

معزز عدالت نادرا [پاکستان اوریجن کارڈ رولز کے رول ۴، ۹ اور ۱۳] کو دیکھتی ہے ۔

---

[5] اس کیس کورٹ پٹیشن نمبر۔ ۲۴۶۹ -پی/۲۰۲۲ [مسماۃ نورین بنام حکومت پاکستان] کے طور پر تلاش کیا جاسکتا ہے۔اس کے مصنف جج، جسٹس جناب وقار احمد ہے۔

[6] ایڈوکیٹ و ممبر ٹیم آئین قانون اوران کو tahirwaziradv@gmail.com کے زریعے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

- رول۴:جو کہتا ہے کہ پاکستان اوریجن کارڈ کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ؛ ایک، درخواست گزار غیر ملکی ہوں؛ دو، وہ پاکستانی شہری سے ازدواج میں منسلک ہوں؛ تین، وہ ماسوائے انڈیا، دشمن ملک یا جو پاکستان نے تسلیم نہ کی ہو کسی ملک سے تعلق رکھتا ہوں۔
- رول۹ :میں نادرا کا اختیار جو رجسٹریشن، انکوائری اور کسی درخواست گزار سے اسکی غیر ملکی شہریت بارے کاغذی ثبوت مانگنے کے حوالے سے ہے۔
- رول ۱۳:نادرا کو کسی کو پاکستان اوریجن کارڈ جاری نہ کرنے کا اختیار دیتا ہے۔

نادرا کے پاس کسی درخواست گزار کو پاکستان اوریجن کارڈ جاری نہ کرنے کا اختیار ہے لیکن درخواست گزار کا موقف تھا کہ نادرا نے پاسپورٹ اور ویزہ کے جو شرائط لگائے ہیں وہ نہایت ظالمانہ، غیر معقول اور غیر منطقی ہے لہذا ان کو سپریم کورٹ کے ابراہیم کیس کے تناظر میں کالعدم قرار دی جائے۔ معزز عدالت اس ایشو کو جانچنے کے لیے افغان شہریوں کے پاکستان آنے کا پس منظر دیکھتی ہے۔ افغان شہری دہائیوں سے پاکستان میں رہ رہے ہیں؛ شادیاں کیں ہیں؛خاندان بھی ان کے ساتھ یہاں ہیں؛ ان سے بچے بھی ہیں؛ اتنا عرصہ گزارنے کے بعد ان کے افغانستان کے ساتھ ناطے منقطع ہو چکے ہیں؛ وہ اس معاشرے میں گل مل گئے ہیں؛ اس کا حصہ بن گئے ہیں۔ اس تناظر میں ان سے پاسپورٹ اور ویزہ مانگنے کے شرائط ظالمانہ، غیر معقول اور غیر منطقی ہے۔ یہ شرائط مینڈیٹری نہیں قرار دیئے جا سکتے۔ اس لیے نادرا کے اپنی فارم کے کالم نمبر۲۰ اور ۲۱ میں ان شرائط کو مینڈیٹری سے آپشنل میں تبدیل کرنے سے مسلہ حل ہوتا ہے۔

عدالت قرار دیتی ہے کہ پاسپورٹ اور ویزہ کا ہونا غیر ملکی شہریت کا واحد ثبوت تو نہیں ہے۔ ان میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو ۲۰۰۵ اور ۲۰۱۸ میں رجسٹریشن کروا چکے؛ افغان شہریت کارڈز لے چکے ہیں۔ اس ضمن میں۲۰۱۶ میں فارنرز ایکٹ ۱۹۴۶ کے دفعہ ۱۴- ڈی میں ترمیم کرتے ہوئے غیر قانونی مہاجرین کو قانونی تحفظ دے دی گئی تھی ۔ لہذا درخواست گزاروں کو غیر قانونی مہاجرین نہیں کہا جا سکتا۔

معزز عدالت قرار دیتی ہے اس طریقہ کار سے نہ صرف غیر ملکی شہری کے ساتھ اچھا برتاؤ ممکن ہو سکے گا بلکہ پاکستانی شہری کو بھی مسائل کے شکار ہونے سے بچایا جا سکے گا۔ یہی آئین پاکستان

کے آرٹیکل۴ کی منشاء ہے۔ آرٹیکل ۳۵ فیملی کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔ اسلامی تعلیمات بھی فیملی کے تحفظ کی تلقین کرتے ہیں۔

معزز عدالت یونیورسل ڈیکلیریشن آف ہیومن رائٹس کے آرٹیکل ۱۶ اور انٹرنشنل کنونشن آن سول اینڈ پولیٹیکل رائیٹس، ۱۹۶۶ کے آرٹیکل۲۳ کو زیر بحث لاتی ہے۔ یہ دونوں مرداورعورت کا بغیر کسی قدغن کے شادی میں بندھنے، یکساں حقوق؛ اور شادی کو معاشرے کا بنیادی اکایہ مانتے ہویے ریاست کو اس کے تحفظ کے زمہ دار ٹھہراتے ہیں۔

عدالت قرار دیتی ہے کہ انہیں وجوہات کی بنا پر نادرا آرڈننس اور پاکستان‌اوریجن‌کارڈ رولز میں کوئی ایسی ظالمانہ اور غیر معقول شرائط نہیں رکھے گئے۔ نادرا/حکومت کے کیے ضروری تھا کہ زیر چیلنج شرائط لاگو کرتے ہوئے ان قوانین کے مقاصد مدنظر رکھتے۔ یہ وہ شرائط ہیں جو مذکورہ قوانین میں نہیں ہے لہذا نادرا خود سے یہ غیر معقول شرائط عائد کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ یہاں عدالت سپریم کورٹ کے ابراہیم شیخ کیس پر انحصار کرتی ہے۔

معزز عدالت انتظامیہ کے فیصلوں کا غیر معقولیت کےبنیاد پر اعلیٰ عدلیہ کا اختیار سماعت اور ان کو اسی بنیاد پہ کالعدم قرار دینے کے لیے غیر ملکی جورس پروڈنس میں ویزبری کارپوریشن کیس پر انحصار کرتی ہے۔ معزز عدالت مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر درخواستیں منظور کرتی ہیں۔

خلاصہ :

پاکستان‌اوریجن‌کارڈ کے حصول کے لیے افغان شہریوں کے لیے پاسپورٹ اور ویزہ کا شرط لازمی نہیں ہے۔ حکام ان کی درخواستوں کو اسی کیس کے تناظر میں دیکھ کر فیصلہ کرے؛ ان کو پاکستان اوریجن‌کارڈ نہ دینے کی صورت میں وجوہات دے؛ درخواست گزاروں کے بچوں کی رجسٹریشن بلا کسی رکاوٹ کے کی جائے؛ شہریت کے حصول کے لیے درخواست گزار وفاقی حکومت کے پاس جا سکتے ہیں۔

میڈیکل کالجوں میں داخلوں کے حوالے سے ہدایات اور پی۔ایم۔ڈی۔سی کے ذمہ داریوں کے حوالے سے سپریم کورٹ کے اہم فیصلہ[7]

مدثر اقبال[8]

کیس کے حقائق:

یہ اپیل لاہور ہائی کورٹ کے ڈویژن بینچ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں دائر کی گئی تھی۔ مدعیان میں میڈیکل اور ڈینٹسٹری کے طلباء اور کالجز شامل تھے، ان کا موقف تھا کہ سیشن ۲۰۱۸/۲۰۱۹ میں پاکستان میڈیکل اینڈ ڈینٹل کونسل کے طرف سے جو داخلے کے آخری تاریخ مقرر کی گئی تھی ان کے گزرنے کے بعد جو میڈیکل سیٹس باقی تھی ان میں ان کو داخلے کی اجازت دی جائے۔

سپریم کورٹ نے ان کی یہ درخواستیں خارج کی۔

عدالت نے کہا کہ پچھلے ۵۷ سالوں سے میڈیکل کا شعبہ پاکستان میڈیکل اینڈ ڈینٹل آرڈیننس ۱۹۶۲ کے تحت ریگولیٹ ہوتا ہے اور میڈیکل اور ڈینٹل میں داخلے، ہاوس جاب اور انٹرنشپ کے لئے ریگولیشن ۲۰۱۸ میں بنائے گئے ہے، تاہم ۱۹۶۲ کے آرڈیننس کو پاکستان میڈیکل کمیشن آرڈیننس ۲۰۱۹ نے ختم کیا اور اس کے تحت پاکستان میڈیکل کمیشن بنایا گیا۔ اس کے تحت کوئی نئے ریگولیشن نہیں بنائے گئے اور ۲۰۱۸ کی ریگولیشن کو ہی اڈاپٹ کیا گیا بعد میں پی۔ایم۔سی نے نئے ریگولیشن بنالیے۔

اس دوران میڈیکل سے منسلک مختلف درخواستیں مختلف عدالتوں میں دائر کی گئی۔ ان مسائل کو ۲۰۱۸ ریگولیشن نے کچھ حد تک ختم کیا، تاہم میڈیکل داخلوں، میرٹ لسٹ اور دیگر مسال کی وجہ سے عدالتی درخواستوں کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ جس کی وجہ سے میڈیکل کالجوں میں داخلوں اور تعلیم کی معیار میں مسلسل کمی آرہی ہے۔

اس کیس میں پیٹیشنر سٹوڈنٹس کا موقف یہ تھا کہ میڈیکل کالج میں داخلوں کی اختتام اور طلباء کی ڈراپ اوٹ کی وجہ سے بہت سارے سیٹس خالی رہ جاتے ہیں جس پر ان کو داخلے کی اجازت دی جائے۔

---

[7] اس فیصلے کے مصنف جج جسٹس اعجاز الحسن ہے اور اس کو [۲۰۲۳ ایس۔سی۔ایم۔آر ۲۱۴۵] کے تحت تلاش کیا جاتا ہے۔

[8] طالب علم شعبہ قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد۔ ان کے ساتھ mudassiriqbal880@gmail.com کے زیر لیے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

پیٹیشنر کالج کا موقف تھا کہ پی۔ایم۔ڈی۔سی کے ۲۰۱۸ ریگولیشن کے تحت ہر کالج کو سیٹوں کی خاص تعداد دی جاتی ہے جس کے تحت داخلے دیئے جاتے ہیں، لیکن داخلوں کی اخری تاریخ کے ختم ہونے کی وجہ ہر کالج میں سیٹیں خالی رہ جاتی ہے، جس سے پی۔ایم۔ڈی۔سی اپنا قانونی زمہ داری پوری نہیں کر رہی۔ان کا یہ بھی موقف تھا کہ پی۔ایم۔ڈی۔سی نے امتیازی رویہ اپناتے ہوئے بولان یونیورسٹی اور حشمت میڈیکل اینڈ ڈینٹل کالج کی سیٹس ایڈجسمنٹ کی ہے۔اس وجہ سے ان کو ۵ سال تک نقصان اٹھانا پڑے گا۔

مدعی الیہ کا موقف تھا کہ انہوں نے کوئی امتیازی رویہ نہیں رکھا کیونکہ حشمت میڈیکل کالج کو کوئی توسیع نہیں دی گئی اور نا ہی ان کو طلباء داخل کرنے کہ اجازت دی گئی کیونکہ اس کو اس نوٹیفکیشن کو وفاقی حکومت نے واپس لیا تھا اور یہ مسلہ توسیع کا نہیں بلکہ ایڈجسمنٹ کا تھا۔بولان یونیورسٹی کو بھی کوئی توسیع نہیں دی گئی مدعی الیہ کی طرف سے اور جو اشتہار انہوں نے دیا تھا وہ پی۔ایم۔ڈی۔سی کے اجازت سے نہیں کیا گیا تھا۔

مدعی الیہ نے یہ بھی کہا کہ صوبہ بلوچستان اور پنجاب میں تعلیمی سال کے شروعات کے تاریخوں میں فرق ہے جس کی وجہ سے ان پر داخلوں کی آخری تاریخ یکساں اپلائی نہیں ہوتی۔مزید انہوں نے کہا کہ ۲۰۱۹ میں پی۔ایم۔ڈی۔سی کے تحلیل ہونے کے بعد ایک غیر معمولی صورتحال آگئی تھی جس کی وجہ سے داخلوں کی اخری تاریخ کو توسیع دی گئی تھی۔۲۰۱۸ کے ریگولیشن کے تحت تعلیمی سال ۹ مہینے کا ہوتا ہے جو کا نا ممکن تھا اگر اس طرح بار بار توسیع دی جائے۔

دونوں اطراف کے وکلاء کو سننے کے بعد عدالت نے یہ کہا کہ لاہور ہائی کورٹ کے ڈویژن بینچ کا فیصلہ صحیح تھا۔تاہم عدالت نے اس کے علاوہ مزید میڈیکل اور ڈینٹل کالج کے داخلوں اور ان کی ریگولیشن میں کمی کو دیکھتے ہوئے مندرجہ ذیل نکات پر اپنا موقف پیش کیا:

1. خالی سیٹوں کے ایڈجسمنٹ کے حوالے سے عدالت نے کہا کہ کس بھی صورت میں خالی غیر داخلہ نہیں کیا جا سکتا۔یہ بھی کہا جن طلباء کی ایگریگیٹ کم ہو گی، ان کو ہر گز داخلہ نہیں دیا جائے گا۔
2. صوبوں میں مختلف تعلیمی سال کے حوالے سے عدالت نے کہا کہ تمام صوبوں میں ایک ہی تعلیمی سال کو فروغ دیا جائے گا اور ساتھ میں ایک ہی داخلوں کا ٹسٹ منعقد ہو گا۔
3. داخلوں کے اغاز اور اختتام کی تاریخ کے حوالے سے عدالت نے کہا کہ ہر تعلیمی سال کے شروع ہونے سے ایک مہینہ قبل داخلوں کے اخری تاریخ جاری کی جائی گی اور داخلوں کے اندراج کے

اخری تاریخ یر تعلیمی سال کے پہلے ہفتے میں دی جائے گی۔اور تمام میڈیکل کالج داخلوں کے اندراج کے اخری تاریخ کت بعد میرٹ لسٹ پی۔ایم۔ڈی۔سی کو جمع کرے گا۔

4. تعلیمی سال کے مدت کے حوالے سے عدالت نے کہا کہ ۲۰۱۸ ریگولیشن کے شق ۲۲ کے تحت تعلیمی سال کی کم سے کم مدت ۹ مہینے ہے۔لیکن اس متعدد مرتبہ کالجوں نے اس کی خلاف ورزی کی ہے اور ہائی کورٹس نے بھی ان کو اجازت دی تھی جس کے وجہ سے یہ کالج چھٹیوں کے دوران کلاسز لیتے تھے۔اور یہ رویہ نئے کالجوں کے لیے بھی استعمال کی گیا۔عدالت نے کہا کہ کسی بھی کالج کو اس مدت کے بائی اس کرنے کی اجازت نا ہو گی۔اور پی۔ایم۔ڈی۔سی اس کو یقینی بنائے گا۔اگر تعلیمی سال کے دوران نئے کالج بن گئے تو ان کو اگلے سال تعلیمی سرگرمیاں شروع کرنی ہو گی۔

5. میڈیکل ٹسٹ اور داخلوں کے عمل کے حوالے سے عدالت نے کہا کہ تمام صوبوں میں یکساں میڈیکل ٹسٹ کے داخلوں کا فارمولہ اختیار کیا جائے گا۔کیونکہ صوبوں میں مختلف فارمولے زیر عمل ہے جس کی وجہ سے طلباء کے ساتھ امتیاز سلوک ہوتا ہے۔

6. کالجوں کی داخلوں کی گنجائش کے حوالے سے عدالت نے کہا ہر کالج کو جو داخلوں کی سیٹ دی جاتی ہے ان کا تعین کم سے کم معیار کے تحت ہو گا اور اس کے لیے ان کے ٹیچنگ اسٹاف، انفراسٹرکچر، رہائش کی گنجائش اور پچھلے سال کی معائنوں کی رپورٹ کو دیکھا جائے گا۔اور یہ کم سے کم معیار ہر حال میں پورا کیا جائے۔اس لیے مختلف درجات قائم کی جائے اور ہر درجہ لیے ایک الگ معیار تعین کی جائے۔

7. کم سے کم معیار کو پورا کرنے کے حوالے سے عدالت نے کہا کہ مختلف کالجز کئی مرتبہ ان معیارات کو فالو نہیں کرتی، اس کے لیے چاہیے کہ معائنہ کی ضرورت کو بڑایا جائے اور ان کے افسران کو تمام ریکارڈ طلب کی اجازت دی جائے۔اس کے علاوہ پی۔ایم۔ڈی۔سی ہر سال ہر کالج کا معائنہ کرنے کا بندوست کرے گی۔

8. کالجوں کے ڈیٹا کی اشاعت کے حوالے سے عدالت نے کہا کہ میڈیکل کالجز کے تمام تر ڈیٹا کو پبلک کیا جائے۔اور ہر کالج کی درجہ بندی کا ایک سسٹم متعارف کروایا جائے۔

9. ماضی میں پی۔ ایم۔ ڈی۔ سی نے کئی ایسے کام کیے جو کہ مفاد عامہ کے خلاف تھے۔ ایک ایسا ریگولیٹری اتھارٹی جس کا، مقصد مفاد عامہ کو تحفظ دینا ہے اس کے بجائے یہ ایک خاص گروپ کے مفاد کے لیے کام کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کا سارا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ اس کو" ریگولیٹرے کیپچر[9]" کہا جاتا ہے۔ اس کا انحصار عدالت عظمیٰ کے ایک فیصلے[10] پر کیا گیا ہے۔ اس کو ختم کرنے کے لیے "مفاد کا کوئی تصادم نہیں[11]" کی دفعہ کو ان ریگولیشن میں شامل کیا جائے۔ اس ریگولیشن اتھارٹی (پی ایم ڈی سی) کے ممبران کے انتخاب کے حوالے سے عدالت نے یہ کہا کہ کسی بھی ممبر کی تقرری کے لئے ضروری ہے کہ ان میں مفادات کا ٹکراؤ نا ہو اور یہ ان سب کے لیے ضروری ہے اگر کوئی ممبر نے مفاد کے ٹکراؤ کر برقرار رکھا تو اس کے رکنیت ختم کرنے کے لیے ایک شق ریگولیشن میں شامل کی جائے۔۔

عدالت نے میڈیکل کالجز میں داخلوں کے حوالے سے مندرجہ بالا ہدایات دینے کے بعد مدعیان کی درخواست کو خارج کر دیا۔

سپریم کورٹ کے ہیومن رائٹس سیل کے حوالے سے سپریم کورٹ کا ایک اہم فیصلہ[12]

محمد ذوالقرنین[13]

کیس کے حقائق:

[9] Regulatory Capture

[10] پی ایل ڈی ۲۰۱۳ سپریم کورٹ ۱۳۲

[11] No Conflict of Interest

[12] یہ اہم فیصلہ ہیومن رائٹس کیس نمبر ۸۲۹۲۸ آف ۲۰۱۸ پر پڑھا اور دیکھا جا سکتا ہے۔

[13] ایڈوکیٹ، پشاور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن و شریک بانی ٹیم آئین و قانون اور ان کو zulqarnain4783@gmail.com کے ذریعے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

زاہدہ جاوید اسلم نام کی ایک خاتون نے سپریم کورٹ کے ہیومن رائٹس سیل کو ایک خط لکھا جس میں انھوں نے معیز احمد خان نام کے ایک شہری پر سنگین الزامات عائد کیے تھے۔ زاہدہ جاوید اسلم کا یہ مسئلہ ہیومن رائٹس سیل کی جانب سے اس وقت کے چیف جسٹس جناب ثاقب نثار کے سامنے چیمبر میں اٹھایا گیا جس پر ریکارڈ کے مطابق انہوں نے دونوں فریقین کو نوٹس کے زریعے طلب کیا جس کے بعد انسداد دہشت گردی پولیس راولپنڈی نے کاروائی شروع کی۔
یاد رہے کہ یہاں تک تو یہ بالکل ایک عام سا کیس ہے لیکن اس کے بعد عدالت کے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ کیا آئین پاکستان کے آرٹیکل۱۸۴[۳]کے تحت کوئی چیف جسٹس چیمبر میں فریقین کو طلب کرنے کے لئے کوئی نوٹس جاری کر سکتا ہے یا نہیں ؟
مندرجہ بالا سوال پر سپریم کورٹ نے عدالت میں موجود سئنیر وکلاء جن میں عامر رحمان صاحب ؛ ایڈیشنل اٹارنی جنرل پاکستان ، فاروق ایچ نائیک صاحب اور سلمان اسلم بٹ صاحب سے مندرجہ بالا معاملے پر عدالت کی رہنمائی کی درخواست کی، جس پر مندرجہ بالا وکلاء نے عدالت کے سامنے متفقہ رائے یہ دی کہ چیف جسٹس یا کوئی بھی جسٹس چیمبر میں صرف وہ اختیارات استعمال کر سکتا ہے جن کا زکر سپریم کورٹ رولز میں ہوا ہو اور سپریم کورٹ رولز میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ کسی بھی فریق کو نوٹس دیا جائے یا پھر کسی کے خلاف کیس درج کیا جائے یا کسی کے خلاف تفتیش کرنے کا حکم دیا جائے۔ وکلاء کی جانب سے عدالت کی رہنمائی کے بعد عدالت نے مندرجہ بالا نکتے پر وضاحت کے لیے سپریم کورٹ کے ہیومن رائٹس سیل کے ڈائریکٹر جنرل کو طلب کیا جس پر ڈائریکٹر جنرل کی جانب سے عدالت کو بتایا گیا کہ ہیومن رائٹس سیل کے اختیارات اور طریقہ کار کے حوالے سے کوئی بھی قانون موجود نہیں ہے۔
عدالت نے مندرجہ بالا وکلاء اور ایڈیشنل اٹارنی جنرل صاحب کے دلائل سننے کے بعد مختصرا یہ قرار دیا کہ چیف جسٹس سمیت کوئی بھی جج چیمبر میں سپریم کورٹ رولز سے ماورا کوئی بھی اختیار استعمال نہیں کر سکتا اور اسی وجہ سے عدالت نے مندرجہ بالا معاملے میں سابق چیف جسٹس جناب ثاقب نثار کی جانب سے اٹھائے جانے والے اقدامات کو خلاف قانون قرار دے دیا۔
عدالت کی جانب سے مندرجہ بالا معاملات کی وضاحت کے بعد عدالت نے ہیومن رائٹس سیل کے دائرہ کار کا رخ کیا ہے اور صراحت کے ساتھ یہ بات لکھی ہے کہ ہیومن رائٹس سیل

صرف ان معاملات پر غور کر سکتی ہے جو اس کو بھیجے جائے اور اگر وہ شکایات آئین پاکستان کے آرٹیکل ۱۸۴[۳] میں موجود حدود و قیود ہر پورا اترتی ہے یعنی شکایت ایسی نوعیت کا ہو کہ جس میں عوامی اہمیت اور بنیادی انسانی حقوق کی تنفیذ کا مسئلہ ہو تو ایسی صورت میں وہ شکایت چیف جسٹس کے سامنے اٹھایا جائے اور چیف جسٹس بھی صرف یہ حکم دے سکتا ہے کہ اس شکایت کو کیس نمبر دیا جائے اور عدالت کے سامنے مقرر کیا جائے اور یہاں پر عدالت نے ایک اور اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ سپریم کورٹ پریکٹس اینڈ پروسیجر ایکٹ کے بعد اب یہ اختیار بھی چیف جسٹس کے پاس نہیں رہا بلکہ اب اس بات کا تعین کہ کیا اس شکایت کو نمبر دیا جائے یا نہیں تو اس کا فیصلہ بھی صرف چیف جسٹس نہیں بلکہ سپریم کورٹ کے تین سینئر ترین ججز صاحبان کریں گے۔

- **نوٹ :** یہ اہم فیصلہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس جناب قاضی فائز عیسیٰ صاحب نے لکھا ہے اور ان کے ساتھ جسٹس امین الدین خان اور جسٹس اطہر من اللہ صاحب نے اتفاق کیا ہے لیکن جسٹس اطہر من اللہ صاحب نے ایک اضافی نوٹ بھی لکھا ہے۔

جسٹس اطہر من اللہ صاحب اپنے اضافی نوٹ میں چند اہم نکات کی طرف توجہ دلاتے ہیں جن میں سر فہرست یہ نکتہ ہے کہ چونکہ اس کورٹ سے اگر کوئی بھی آرڈر ، خط یا کوئی بھی حکم دیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ یہ تاثر لازمی جاتا ہے کہ یہ عدالتی حکم یا فیصلہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ فریقین کو نوٹس کے بعد چیمبر کاروائی فریقین کے منصفانہ ٹرائل کے حق کے خلاف ہے۔ اس نکتے کی وضاحت کے بعد جسٹس اطہر من اللہ صاحب نے آئین پاکستان کے تحت سپریم کورٹ کو اختیار سماعت کے حوالے سے حاصل حقوق کی بات کی ہے اور اسی وجہ سے جسٹس صاحب نے لکھا ہے کہ ہیومن رائٹس سیل کو ایسا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے کہ جس کی نوعیت عدالتی ہو اور جس سے فریقین کے اختیارات کسی بھی حوالے سے متاثر ہو سکتے ہوں۔ اس کے بعد جسٹس صاحب نے ہیومن رائٹس سیل کا دائرہ اختیار یہ زکر کیا ہے کہ وہ صرف عوام سے شکایات کو وصول کر سکتی ہے اور پھر ان شکایات کو چیف جسٹس کے سامنے رکھے گی تاکہ وہ سپریم کورٹ رولز کے تحت ان کا جائزہ لے سکیں اور مندرجہ بالا اختیارات کے علاوہ ہیومن

رائٹس سیل نے اگر کچھ کیا ہے یا پھر کسی بھی جج یا پھر کسی بھی چیف جسٹس نے کیا ہو تو وہ خلاف آئین اور خلاف قانون ہیں۔

بینولنٹ فنڈ، سروس بینیفٹس اور نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹ وغیرہ کے ترکہ /وراثت میں شمار ہونے یا نہ ہونے کے حوالے سے سندھ ہائی کورٹ کا ایک اہم فیصلہ[14]

محمد ذوالقرنین[15]

کیس کے حقائق:

عبد الغنی خاصخیلی نام کا ایک بندہ جو کہ بنیادی طور پر ایک بینک میں بطور اسسٹنٹ نائب صدر کے طور پر کام کرتے ہوئے دوران نوکری فوت ہوگیا تھا .عبد الغنی خاصخیلی [میت / مؤرث] کی وفات ان کے بھائی یعنی واحد بخش نے میت کے چھوڑے ہوئے سروس بینیفٹس اور نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹ کے حصول کے لیے سول کورٹ سے رجوع کیا اور عدالت سے یہ استدعا کی کہ یہ عدالت یہ قرار دے کہ میت کے چھوڑے ہوئے ترکے یعنی مال میں میت کی بیوہ کے ساتھ ساتھ وہ بھی میت کا بھائی ہونے کی حیثیت سے شرعی طور پر حقدار ہے۔ واحد بخش کے اس درخواست کا جواب میت کی بیوہ نے کچھ اس طرح دیا کہ صرف وہ ہی میت کے چھوڑے ہوئے ترکے کی حقدارہ ہے کیونکہ بینک کے رولز کے مطابق بھائی " خاندان "کی تعریف سے باہر ہے اور چونکہ سروس بینیفٹس کا شمار ترکے میں نہیں کیا جا سکتا تو اس لئے بھی واحد بخش اس کا حقدار نا ہے۔

---

[14]یہ اہم فیصلہ عدالت عالیہ سندھ کے جسٹس ندیم اختر نے لکھا ہے جو کہ پی۔ایل۔ڈی ۲۰۲۳سندھ صفحہ ۱۳۱ پر دیکھا اور پڑھا جا سکتا ہے۔

[15]ایڈووکیٹ، پشاور بار ایسوسی ایشن و شریک بانی ٹیم آئین و قانون اوران کو zulqarnain4783@gmail.com کے ذریعے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

ٹرائل کورٹ یعنی سول کورٹ نے ایک لمبے ٹرائل کے بعد۲۰۱۹ میں میت کے بھائی یعنی واحد بخش کی جانب سے کئے گئے دعوے کو مسترد کرتے ہوئے میت کی بیوہ کو ہی میت کے چھوڑے ہوئے مال کا حقدار قرار دے دیا۔ سول کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف واحد بخش نے ضلعی عدالت میں اپیل جمع کی جس کا فیصلہ کچھ یوں آیا کہ سروس رولز کے روشنی میں بینولنٹ فنڈ ترکے میں شمار ہوتے ہیں جبکہ نیشنل سیونگ سرٹیفیکیٹ میں بھی واحد بخش چونکہ میت کی جانب نامزد ہوا ہوتا ہے تو اس لئے ضلعی عدالت نے فیصلہ دیا کہ واحد بینولنٹ فنڈ میں بھی ۵۰ فیصد حصے کا حقدار ہے جبکہ اس کے ساتھ واحد بخش کو ضلعی عدالت نے نیشنل سیونگ سرٹیفیکیٹ میں بھی میت کی جانب سے نامزد ہونے کی وجہ حصہ دار قرار دے دیا۔ ضلعی عدالت کے اس فیصلے کے خلاف میت کی بیوہ کی جانب سے سندھ ہائی کورٹ سے رجوع کیا گیا جس کے بعد اس کیس کا آغاز ہوتا ہے۔

- **نوٹ** : یاد رہے کہ سندھ کی عدالت عالیہ تک یہ کیس پہنچنے تک نہ صرف میت کا بھائی یعنی واحد بخش بلکہ ساتھ میت کی بیوہ بھی وفات پا چکے ہوتے ہیں جس کے بعد اس کیس کو فریقین کے ورثاء چلا رہے ہوتے ہیں۔

سندھ ہائی کورٹ میں میت کی بیوہ کی جانب سے ضلعی عدالت کے فیصلے کو سپریم کورٹ کی شریعت اپیلیٹ بینچ کے مشہور زمانہ فیصلے وفاقی حکومت پاکستان بنام عوام الناس کے ساتھ ساتھ اسلام کے بھی منافی قرار دے اس کو کالعدم کرنے کی استدعا کرتے ہیں۔ میت کی بیوہ کے وکلا کی جانب سے اس ایک نکتے پر زور دیا جاتا ہے کہ سروس بینیفٹس کو کسی صورت بھی ترکے میں شمار نہیں کیا جا سکتا جبکہ نیشنل سیونگ سرٹیفیکیٹ کے بارے میں میت کی بیوہ کے وکلاء کا کہنا تھا کہ میت کی بیوہ اکیلے ہی نیشنل سیونگ سرٹیفیکیٹ کی حقدارہ ہے کیونکہ میت نے بذات خود اپنی زندگی میں ہی اس کو پورے کے پورے نیشنل سیونگ سرٹیفیکیٹ کے لئے نامزد کیا ہوتا ہے اور اس حقیقت پر میت کے بھائی نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا ہوتا۔ دوسری طرف اس کے برعکس میت کے بھائی کے وکلاء کے دلائل یہ تھے کہ نیشنل سیونگ سرٹیفیکیٹ میں میت کی جانب سے نامزد کرنے کی کوئی حیثیت نہیں ہے کیونکہ نیشنل سیونگ سرٹیفیکیٹ ترکے میں شمار ہوتا ہے اور ترکہ دونوں ورثاء میں اپنے اپنے حصے کے مطابق تقسیم ہوگا جبکہ سروس بینیفٹس

وغیرہ کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ چونکہ میت کی کوئی اولاد نہیں تھی تو میت کا حقیقی بھائی ہونے کی حیثیت سے میت کا بھائی بھی اپنے حصے کا حقدار ہے اور اسی لئے انہوں نے عدالت عالیہ سے استدعا کی کہ ضلعی عدالت کے فیصلے کو برقرار رکھا جائے۔

عدالت کے سامنے سوالات:

- کیا سروس بینیفٹس کی حقدار صرف میت کی بیوہ ہے یا پھر یہ ورثاء کے درمیان تقسیم ہوگی ؟
- کیا نیشنل سیونگ سرٹیفیکیٹ میں میت کی بیوہ صرف اس بنیاد پر حقدارہ ہے کہ اس کے شوہر نے اپنی زندگی میں ہی اس کو نیشنل سیونگ سرٹیفیکیٹ میں سو فیصد حصے کے لئے نامزد کیا تھا یا پھر نیشنل سیونگ سرٹیفیکیٹ بھی ورثاء میں تقسیم ہوگا ؟

مندرجہ بالا سوالات کے جوابات کی طرف آنے سے پہلے عدالت نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ میت کا ان دونوں یعنی بھائی اور بیوہ کے علاوہ کوئی اور وارث نہیں ہے اور ساتھ ہی ساتھ عدالت نے صراحت کے ساتھ یہ بھی واضح کیا ہے کہ میت کے ورثا صرف اور صرف میت کے چھوڑے ہوئے مال یعنی ترکے میں حقدار ہوتے ہیں اور اگر کوئی مال ترکہ میں شمار نہیں ہو سکتا تو وہ وراثت نہیں کہلائے گا۔ اس تمہید کے بعد عدالت نے واضح کیا ہے کہ ہمارے دیکھنے کا کام یہ ہے کہ کیا سروس بینیفٹس اور نیشنل سیونگ سرٹیفیکیٹ ترکے میں شمار ہو سکتے یا نہیں۔ عدالت عالیہ نے اپنے سامنے سوال کی وضاحت کے بعد فورا سپریم کورٹ کے شریعت اپیلیٹ بینچ کے مشہور زمانہ فیصلے وفاقی حکومت پاکستان بنام عوام الناس کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ اس فیصلے کی روشنی میں صرف اور صرف وہ مال ترکہ شمار ہوگا جو فوتگی کے وقت میت کی ملکیت میں ہوگا یا پھر کوئی ایسا حق جو زندگی میں ہی میت مطلقاً مانگ سکتا تھا یعنی زندگی میں ہی حقدار ہو گیا تھا۔ عدالت نے مندرجہ بالا تمہید کے بعد پہلے نیشنل سیونگ سرٹیفیکیٹ والے قضیے کو چھیڑا ہے جس کے بارے میں عدالت اس نتیجے پر پہنچی کہ چونکہ نیشنل سیونگ سرٹیفیکیٹ زندگی میں ہی میت کے نام ہوگئے تھے تو شریعت اپیلیٹ بینچ کے فیصلے کی روشنی میں وہ ترکے میں شمار ہونگی اور اسی لئے نیشنل سیونگ سرٹیفیکیٹ ورثا کے درمیان شرعی حصوں کے مطابق تقسیم ہونگی۔ یہاں پر یاد رہے کہ چونکہ میت نے اپنی بیوہ کو اپنی زندگی میں ہی نیشنل سیونگ سرٹیفیکیٹ میں ۱۰۰ فیصد

حصے کے لئے نامزد کیا تھا تو عدالت نے اس حوالے سے پوزیشن واضح کی ہے کہ جو مال ترکہ شمار ہوگی تو اس میں میت کی جانب سے نامزدگی کی کوئی وقعت یا اہمیت نہیں ہے بلکہ نامزد کردہ شخص صرف ٹرسٹی شمار ہو سکتا ہے لیکن وہ مالک شمار نہیں ہو سکتا۔

نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹ کا قضیہ حل کرنے کے بعد عدالت نے سروس بینیفٹس والے قضیے کا رخ کیا ہے اور اپنے سامنے دوبارہ وہی سوال رکھا ہے کہ کیا بینولنٹ فنڈ ، سروس بینیفٹس ترکے میں شمار ہوں گے یا نہیں تو عدالت نے صراحت کے ساتھ شریعت اپیلیٹ بینچ کے فیصلے میں روشنی میں یہ قرار دیا کہ سروس بینیفٹس چاہے وہ گرانٹ ، ڈونیشن ، باونٹی ، کنسیشن یا کمپینسیشن وغیرہ ترکے میں شمار نہیں ہو سکتے اور اسی لئے عدالت عالیہ نے اس حد تک میت کے بھائی کے دعوے کو مسترد کر دیا اور یہ قرار دیا کہ چونکہ بینک رولز کے تحت یہ بینیفٹس صرف " خاندان " کو ہی دستیاب ہوں گی اور رولز کے مطابق خاندان سے مراد بیوی /شوہر اور بچے شامل ہیں تو اس لئے سروس بینیفٹس کی حقدارہ صرف اور صرف بیوہ ہے تو اس حد تک عدالت نے ضلعی عدالت کے فیصلے کو کالعدم قرار دے دیا۔

خلاصہ:

اس انتہائی اہم فیصلے کا خلاصہ یہ ہے کہ میت کے ورثا صرف اور صرف میت کے چھوڑے ہوئے مال یعنی ترکے میں حقدار ہوتے ہیں اور اگر کوئی مال ترکہ میں شمار نہیں ہو سکتا تو وہ وراثت نہیں کہلائے گا اور جو مال ترکہ شمار ہوگا تو اس میں میت کی جانب نامزدگی کی کوئی خاص وقعت یا حیثیت نہیں ہوگی بلکہ وہ شرعی حصوں کے مطابق تقسیم ہوگا۔ نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹ زندگی میں ہی نام ہونے کی وجہ سے ترکہ شمار ہونگی جبکہ سروس بینیفٹس چاہے وہ گرانٹ ، ڈونیشن ، باونٹی ، کنسیشن یا کمپینسیشن وغیرہ ترکے میں شمار نہیں ہو سکتے اور اسی لئے وہ ورثاء میں تقسیم ہونے کی بجائے رولز کے مطابق خاندان یعنی بیوی بچوں میں ہی تقسیم ہوں گے۔

سپریم کورٹ کا وراثتی جائیداد میں فریق ثالث مفادات وجود میں آنے اور طویل مدت کے بعد وراثت کے حق کا دعوی کرنے کے متعلق ایک اہم فیصلہ[16]

افراسیاب خان[17]

کیس کے حقائق:

آدم خان کے پسماندگان میں دو بیٹے کرم خان اور قائم خان تھے۔ کرم خان کا ایک بیٹا نواب خان تھا، جس کے بعد ایک بیٹا حفیظ اللہ بھی تھا۔ حفیظ اللہ کے قانونی ورثاء موجودہ درخواست میں جواب دہندگان نمبر اتا ۴ ہیں۔ اس کے برعکس قائم خان کے تین بیٹے تھے۔ محیم خان، مہر اللہ اور حبیب اللہ۔ محیم خان اور حبیب اللہ دونوں بغیر اولاد مر گئے، جبکہ مہر اللہ کے پسماندگان میں ایک بیٹی، خانزادی تھی۔

موجودہ کیس میں اپیل کنندہ نے محترمہ خانزادی کے قانونی وارث ہونے کی حیثیت سے قائم خان کی وراثت میں اپنا حصہ مانگا ہے۔ جس کے متعلق تمام نچلی عدالتیں نے اپنے فیصلوں میں درخواست گزار کی درخواست کو لیمیٹیشن (میعاد) کی بنیاد پر مسترد کیا۔ جس کی وجہ سے درخواست گزار اعلی عدلیہ یعنی سپریم کورٹ کا رخ کرتے ہیں اور دو فاضل ججز پر مشتمل بنچ جس میں جسٹس یحیی آفریدی اور جسٹس جمال خان مندوخیل شامل ہوتے ہیں، اس کیس کی سماعت کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ نہ تو قائم خان کے بیٹے مہر اللہ، اور نہ ہی اسکی پوتی (مہر اللہ کی بیٹی) خانزادی نے اپنی زندگی میں اپنے حصے کا دعویٰ کیا تھا۔ اور، قابل ذکر بات یہ ہے کہ موجودہ اپیل کنندگان کی طرف سے دائر مقدمہ ۲۰۰۷ میں قائم کیا گیا تھا، جب کہ اطلاعات کے مطابق خانزادی اس سے تقریباً ایک چوتھائی [۴/۱] صدی قبل انتقال کر چکی تھی۔ جس پراپرٹی کے متعلق تنازعہ تھا وہ بھی آگے منتقل ہو چکی تھی۔

وکلاء کے دلائل:

---

[16] یہ دو ممبر بینچ کا یہ فیصلہ جسٹس یحیی آفریدی نے لکھا ہے، اور اسے [سول اپیل نمبر ۲۵-کیو آف ۲۰۱۸] کے حوالے کے تحت تلاش کیا جا سکتا ہے۔

[17] طالب علم، شریعہ و قانون بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد و ممبر ٹیم آئین و قانون ۔ ان کو afr.khan95@gmail.com کے زریعے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

اپیل کنندگان کے وکیل کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ وراثت کا حق کسی لیمٹیشن (میعاد) کے قانون کا پابند نہیں ہے، اور اسلامی قانون کے تحت، قانونی وارثوں کا حق پیش رو کی موت کے وقت خود بخود مل جاتا ہے، جس کو قائم کرنے کے لئے کسی اندراج کی ضرورت نہیں۔ ساتھ ہی وہ جواب دہندگان کی طرف سے دھوکہ دہی کے ارتکاب کا الزامات بھی لگاتے ہیں، کہ محترمہ خانزادی کا نام دھوکہ دہی سے شجرہ نسب (نسب نامہ) سے خارج کر دیا گیا، اور اس طرح متنازعہ جائیداد کی براہ راست منتقلی کامیاب طریقے سے سرانجام ہوئی۔

دوسری جانب مدعاعلیہان کے وکیل نے پرزور استدلال کیا کہ موجودہ کیس کے حالات کسی مداخلت کی ضمانت نہیں دیتے، کیونکہ اپیل کنندگان کے کیس میں وقت کی پابندی کا اطلاق نہیں ہوا، یعنی اپیل کنندہ کا کیس ٹائم بارڈ ہے۔ اس طرح ان کے کیس اور قائم خان کی موت کے درمیان گزر جانے والی مدت کو دیکھے تو اس دوران قائم خان کے بیٹے مہراللہ اور اس کے بعد ان کی پوتی خانزادی نے کوئی مسئلہ نہیں اٹھایا تھا اور موجودہ جائداد میں اب تیسرے فریق کی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔

تمام نچلی عدالتیں نے اپنے فیصلوں میں درخواست گزار کی درخواست کو لیمٹیشن (میعاد) کی بنیاد پر مسترد کیا۔ لیکن جب سپریم کورٹ کے سامنے یہ کیس آیا تو عدالت کے سامنے مرکزی سوال یہ تھا کہ کیا لیمٹیشن کا قانون کسی ایسے معاملے پر لاگو ہوتا ہے جب متوفی پیشرو کی جائیداد میں فریق ثالث کا مفاد پہلے ہی قائم ہو چکا ہو۔

اس کیس میں عدالت نے لیمٹیشن ایکٹ، ۱۹۰۸ [قانون میعاد] کے دفعہ ۱۸ کا بھی حوالہ دیا، جو کسی ایسے شخص کے لیے محدود مدت کی گنتی میں ریلیف فراہم کرتا ہے جو دھوکہ دہی کی بنیاد پر مقدمہ کرنے کے اپنے حق کے علم سے محروم ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ عدالت نے اس بات پر زور دیا کہ قانونی ورثاء کو اپنے ملکیتی حقوق کے بارے میں چوکنا رہنا چاہیے اور ثبوت کا بوجھ دعویدار وارث پر ہے کہ وہ یہ ظاہر کرے اور ثابت کرے کہ وہ محروم ہونے یا دھوکہ دہی قائم کرنے کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ جس پر اپیل کنندہ کی جانب سے عدالت کو کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ حفیظ اللہ (جواب دہندگان کے والد) نے ۱۹۵۸-۰۶ کے دوران ریونیو ریکارڈ میں مہر اللہ کا حصہ اپنے نام کر دیا تھا اور ۱۹۹۴ اور ۱۹۹۷ میں متنازعہ جائیداد کے کچھ حصے دوسروں کو فروخت کر دیے۔ ۶۰ سال پہلے [لیمٹیشن ایکٹ کے شیڈول دوم کے آرٹیکل ۱۲۰] کے تحت حد بندی کی مدت ختم ہو چکی ہے اور اس لیے اپیل کنندگان کی جانب سے ۲۰۰۷ میں دائر کیے گئے مقدمے کو وقتی پابندی (ٹائم بارڈ) لگا دی گئی ہے۔ مزید برآں، مدعی کی جانب سے دائر درخواست کے پیرا گراف ۱۴ اور ۱۷ میں، اپیل کنندگان نے

دعویٰ کیا کہ ان کی کارروائی کا سبب مارچ ۲۰۰۶ میں پیدا ہوا، یعنی یہ منتقلی حال ہی میں ہوئی ہے لیکن وہ یہ دعویٰ ثابت کرنے میں ناکام رہیں۔

عدالت کا فیصلہ:

عدالت نے بالآخر فیصلہ کیا کہ اپیل کنندگان نے موجودہ کیس میں متعلقہ سوال پر خاص طور پر توجہ نہیں دی، یعنی، کیا قانون کی لیمٹیشن (میعاد) اس کیس پر لاگو ہوتی ہے جب متوفی پیشرو کی جائیداد میں فریق ثالث کا مفاد پہلے ہی قائم ہو چکا ہو۔ عدالت نے پایا کہ اپیل کنندگان نے مقررہ مدت کے اندر اپنے حق کا دعویٰ کرتے ہوئے مقدمہ قائم نہیں کیا، اور اس لیے، تیسرے فریق کے ساتھ پہلے سے طے شدہ لین دین میں خلل ڈالنا نامناسب ہوگا۔ نتیجے کے طور پر، عدالت نے لیمٹیشن (میعاد) کی بنیاد پر نچلی عدالتوں کے ذریعہ اپیل کنندگان کے دعوے کی برخاستگی کو برقرار رکھا۔

خلاصہ:

اس فیصلے یہ اصول طے پایا کہ وراثت کے حق کا دعویٰ ایک طویل مدت کے بعد اور فریق ثالث کے مفادات کی وجہ لیمٹیشن (میعاد) کے زمرے میں آسکتا ہے۔

حق شفعہ کے حوالے سے سپریم کورٹ کے جج، جسٹس قاضی فائز عیسیٰ کا ایک اہم فیصلہ [18]

طاہر خان وزیر [19]

کیس کے حقائق:

ایک کیس میں ٹرائل کورٹ حق شفعہ کا دعویٰ مسترد کرتی ہے، ڈسٹرکٹ کورٹ اپیل میں ٹرائل کورٹ کے فیصلے کو کالعدم قرار دیتی ہے، ہائی کورٹ ڈسٹرکٹ کورٹ کا فیصلہ برقرار رکھتی ہے۔ ٹرائل کورٹ اس بنا پر کیس خارج کرتی

[18] اس فیصلے کے مصنف جج جسٹس قاضی فائز عیسیٰ اور ان کے ساتھ بینچ میں جسٹس جواد ایس خواجہ شامل ہے۔ اس کو [پی ایل ڈی ۲۰۱۵ سپریم کورٹ صفحہ ۶۹] "سبحان الدین وغیرہ بنام پیر غلام" کے طور پر تلاش کیا جاسکتا ہے۔

[19] ایڈووکیٹ و ممبر ٹیم آئین و قانون۔

ہے کہ مدعی [سپریم کورٹ میں جواب دہندہ] طلب مواثبت[20] سے متعلقہ لوازمات پورا نہ کر سکا ہے۔ یعنی طلب مواثبت فوری طور پر نہ دینا، فوری ڈیمانڈ کا نہ کرنا، شفیع کا طلب مواثبت سے پہلے زمین کی انتقال کے موقع پر موجود ہونا [واقعات سے لگتا ہے]، گواہوں کے مابین تضادات پر مبنی بیانات ایسے عوامل تھے جس کی وجہ سے ٹرائل کورٹ نے شفیع کا دعویٰ خارج کیا۔

عدالت کے سامنے بنیادی سوال:

بنیادی سوال یہ تھا کہ گواہان کے بیانات میں تضادات کا طلب مواثبت پر اثر کیا ہے ؟۔

عدالت کا فیصلہ:

سپریم کورٹ کے سامنے یہ تسلیم شدہ اور واضح پوزیشن تھی کہ زمین کی فروخت اور انتقال کی خبر شفیع کو اس کے بھائی تاج ولی نے دی جب کہ تاج علی کو خبر نذیر سے ملی جس کو بطور گواہ پیش نہ کیا گیا۔ سپریم کورٹ شفیع کے بھائی اور مخبر تاج علی اور نذیر کے پوزیشنز کو دیکھتی ہے۔ تاج علی کہتا ہے کہ انہوں شفیع کو پنجاب سے گھر واپس آنے پر زمین کی فروخت کا بتایا۔ تاہم تاج علی، جو شفیع کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتا ہے کو یہ پتہ نہیں کہ ان کا بھائی (شفیع) کب پنجاب گیا اور کب گھر واپس آیا تھا۔ تاج ولی اپنے بیان میں کہتے ہے کہ ان کو زمین کے فروخت کے حوالے سے ان کے بھانجے نذیر نے بتایا۔ اس نکتہ پہ عدالت قانون شہادت آرڈر، ۱۹۸۴ کے آرٹیکل ۱۷ کو زیر بحث لاتے ہوئے قرار دیتی ہے کہ اس کے تحت نذیر کو بطور گواہ پیش کرنا ضروری تھا۔ کیوں کہ یہ شفعہ زبانی شہادت پہ مبنی ہے جس کا بلا واسطہ ہونا اور ثابت کرنا لازمی ہے جو امر صرف نذیر کو بطور گواہ پیش کر کے ہی پورا کیا جا سکتا تھا۔ عدالت قرار دیتی ہے کہ اسی ایک ناکامی پر ہی شفیع کا دعویٰ خارج کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ طلب مواثبت زمین کی فروخت کے فوری بعد دینا ہوتا ہے۔ یہی [خیبر پختونخوا، قانون شفعہ، ۱۹۸۷] کے دفعہ ۱۳[1] کے مطابق ہے۔ اسی طرح ایک حدیث[21] کو زیر بحث لاتی ہے۔

اس کے ساتھ عدالت ایک اہم نکتہ کو شریعت کی نظر میں دیکھتی ہے۔ مدعی نے اپنے دعویٰ میں لکھا کہ فریقین کے مابین زمین کی قیمت ۲۰ ہزار روپے [نہ کہ ۷۳ ہزار] تھی جو کہ مدعی ثابت نہ کر سکا۔ اس پر عدالت نے قرار دیا کہ

---

[20] طلب مواثبت سے مراد "جائیداد مشفوعہ کی فروخت کا علم ہوتے ہی شفیع کا اپنا حق شفعہ طلب کرنا"۔

[21] حدیث: شفعہ کا حق اس کے حق میں جاتا ہے جو فوری اس حق کا دعویٰ کرے۔

شریعت میں اس قسم کے دعوے جو محض ناجائز فائدہ کے حصول کے لیے کیے جائے اور بعد میں ثابت نہ کیے جانے کی وجہ سے شفیع کو حق شفعہ سے محروم کردے گا۔

عدالت قرار دیتی ہے کہ اس کیس میں نذیر جس نے زمین کی فروخت کی اطلاع دی کو بطور گواہ پیش نہ کیا گیا، شفیع کے بھائی کی شفیع سے متعلق یہ معلومات کہ پنجاب میں کہاں تھے اور کب واپس آئے سے لاعلمی باوجود اس کے کہ دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہیں کی وجہ سے طلب مواثبت کی نفی ہوتی ہے۔ اسی بناپر عدالت نے اپیل منظور کرتے ہوئے حق شفعہ کا دعویٰ مسترد کردیا۔

انتخابات کے فیصلے

پی ٹی آئی انٹرا پارٹی الیکشنز اور بلے کے انتخابی نشان سے متعلق الیکشن کمیشن کے پہلے اہم آرڈر[مورخہ ۱۳ نومبر۲۰۲۳] کا خلاصہ[22]

محمد اسد[23]

ابتدائیہ:

پی ٹی آئی کے انتخابی نشان سے متعلق سپریم کورٹ کے ۳ رکنی بینچ کا ۱۳ جنوری، ۲۰۲۴ کا آرڈر مکمل اور درست تناظر میں سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ ہم اس سارے واقعے کے بظاہر اختتام یا آخری چند لمحات کو دیکھنے کے بجائے اسکو شروعات سے دیکھیں و پڑھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ آخر معاملات یہاں تک کیونکر اور کس کی وجہ سے پہنچے۔ یہ تحریر اس ادنی سی کاوش کی پہلی کوشش ہے جس میں ہم الیکشن کمیشن کے ۱۳ نومبر، ۲۰۲۳ کے اس آرڈر کا خلاصہ بیان کریں

[22] آرڈر کا حوالہ: کیس نمبر ۳[۱۰] آف ۲۰۲۲

[23] طالب علم شریعہ اینڈ لاء، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد و ممبر ٹیم آئین و قانون اور انہیں assadmuhammad623@gmail.com کے زریعے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

گے جس میں پی ٹی آئی کے ایک پارٹی الیکشن کو نہ صرف کالعدم قرار دیا گیا بلکہ اس کو ۲۰ دنوں کے اندر دوبارہ الیکشن منعقد کروانے کا حکم بھی دیا گیا۔

حقائق و بنیادی معلومات :

اس آرڈر کی تفصیل میں جانے سے پہلے بہتر ہے کہ اس سے متعلق تفصیلی حقائق و کچھ بنیادی قانونی معلومات بیان کر دی جائیں تاکہ اس الجھے ہوئے کیس کو سمجھنے اور سمجھانے میں آسانی رہے۔

سب سے پہلے تو یہ بات ذہن نشین رہے کہ اگرچہ پارٹی کے اندرونی انتخابات کیلئے پارلیمان کے بنائے ہوئے الیکشن ایکٹ ،۲۰۱۷ میں چند ایک رہنما اصولوں سمیت انتخابات منعقد کروانے کے بعد مقررہ وقت کے اندرچند ایک ضروری کاغذات ومعلومات بطریقہ مقررہ الیکشن کمیشن کو پارٹی نے جمع کروانے ہوتے ہیں لیکن بنیادی طور پر کسی بھی سیاسی جماعت کے اندرونی انتخابات ، اس پارٹی کے اپنے آئین میں وضع کیے گئے طریقہ کار کے مطابق کروانا ہوتے ہیں اور ہر رجسٹرڈ سیاسی جماعت کے لیے الیکشن ایکٹ ،۲۰۱۷ کے دفعہ ۲۰۱ کے تحت اپنا پارٹی آئین نہ صرف الیکشن کمیشن کو جمع کروانا ہوتا ہے، بلکہ اس آئین میں کافی ساری چیزوں کے ساتھ پارٹی کے اندرونی انتخابات کیلئے طریقہ کار، اسکی میعاد وغیرہ درج کرنا ضروری ہے، مزید یہ کہ پارٹی آئین میں کوئی بھی ترمیم یا مکمل آئین تبدیل کرنے کی صورت بھی مذکورہ دفعہ ۲۰۱ میں درج طریقہ کار کے ذریعے الیکشن کمیشن کو آگاہ کرنا ضروری ہے۔

دوسری بات یہ کہ پی ٹی آئی نے اپنے اندورنی انتخابات آخری بار ۲۰۱۷ میں کروائے تھے، اور الیکشن ایکٹ کی اس مذکورہ دفعہ پر عمل کرتے ہوئے پی ٹی آئی نے جو آئین الیکشن کمیشن کو جمع کروایا تھا، اس کے مطابق دوبارہ اندرونی انتخابات ۱۳ جون، ۲۰۲۱ تک کروانے ضروری تھے لیکن پارٹی نے الیکشن کمیشن سے درخواست کی کہ کرونا وائرس کی وباء کی بنا پر مقررہ وقت یعنی۱۳ جون، ۲۰۲۱ کو پارٹی اندرونی انتخابات نہیں کرواسکتی ، جس کی وجہ سے الیکشن کمیشن نے پی ٹی آئی کو ایک سال کا مزید وقت اپنے اندرونی انتخابات کیلئے دے دیا، یعنی تحریک انصاف کے اندرونی انتخابات اب مورخہ ۱۳ جون، ۲۰۲۲ کو منعقد ہونا قرار پائے لیکن تحریک انصاف اس ۱ سال کے

عرصہ میں اس وقت تک الیکشن کروانے سے متعلق خاموش رہی، جب تک الیکشن کمیشن نے اسکو ایک سال کا عرصہ ختم ہونے کے قریب کئی ایک نوٹس نا بھجوائے۔

مذکورہ نوسٹر کے جواب میں پی ٹی آئی کے چیف الیکشن کمشنر جمال اکبر انصاری نے ۹ اور ۱۰ جون، ۲۰۲۲ کو لکھے گئے، دو خطوط الیکشن کمیشن آفس کو بھجوائے، جس میں یہ اطلاع دی گئی کہ تحریک انصاف نے ۸ جون ،۲۰۲۲ کو اپنے پارٹی آئین کے آرٹیکل ۵ کی ذیلی شق نمبر ۵ میں ترمیم کرتے ہوئے پارٹی عہدیداروں کے چناؤ سے متعلق اپنے الکیٹورل کالج، یعنی کون انکا انتخاب کر سکتا ہے ، کو تبدیل کرنے کے سمیت ووٹ ڈالنے کا طریقہ کار بھی خفیہ ووٹنگ سے[شو آف ہینڈز][24] کر لیا ہے۔ مزید بتایا گیا کہ ۱۰ جون، ۲۰۲۲ کو آئین میں کی گئی مذکورہ ترمیم کے تحت پارٹی انتخابات بھی کروا دیے گئے ہیں۔

لیکن جوابا الیکشن کمیشن نے بذریعہ خط مورخہ ۲۲ جون، ۲۰۲۲ کو تحریک انصاف کو آگاہ کیا کہ پارٹی انتخابات سے اور پارٹی آئین میں ترمیم سے متعلق الیکشن کمیشن کو مطلع کرنے کے واسطے محض خطوط ارسال کرنے کے بجائے، الیکشن ایکٹ، ۲۰۱۷ کی دفعہ ۲۰۹ و الیکشن رولز، ۲۰۱۷ کے رول ۱۵۸ میں ذکر کردہ سرٹیفکیٹ[فارم ٦٥] کو وضع کردہ طریقہ کار کے مطابق جمع کروایا جائے جس میں الیکشن انعقاد کی تاریخ، رزلٹ، کامیاب امیدواوران وغیرہ کی تفصیل درج ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مزید یہ ہدایت کی کہ پارٹی آئین میں ترمیم سے متعلق منظور شدہ قرارداد بھی الیکشن ایکٹ کی دفعہ ۲۰۱ میں درج قانونی تقاضوں کو پورا کر کے جمع کروائی جائے۔ جوابا گو کہ پی ٹی آئی نے اپنے مذکورہ خامیوں کو دوبارہ ایک اور خط کے ذریعے صحیح کرنے کی کوشش کی لیکن پھر سے وہی پرانی غلطیاں دھرائی، جس کی نشاندھی الیکشن کمیشن نے اپنے خط مورخہ ۸ اگست، ۲۰۲۲ کے ذریعہ دوبارہ کر دی۔

جوابا تحریک انصاف نے مورخہ ۱۹ اگست، ۲۰۲۲ کو لکھے گئے ایک خط کے ذریعے ایک بار پھر سے اپنی پرانی غلطیاں ٹھیک کرنے کی ناکام کوشش کی اور پھر سے ادھورے کاغذات جمع کروانے کے ساتھ اس دفعہ پرانے آئین کی جگہ ایک نیا ترمیم شدہ آئین بھی الیکشن کمیشن کو جمع کروایا

[24] Show of hands.

جسکو بقول پی ٹی آئی کے نیشنل کونسل نامی ادارہ[جو کہ پارٹی آئین کے مطابق آئین میں ترمیم کرنے یا نیا آئین بنانے و منظور کرنے کا اختیار رکھتا ہے] نے ۱ اگست ۲۰۲۲ کو منظور کیا تھا۔ پے در پے ادھورے کاغذات اور نیا آئین جمع کروانے کی وجہ سے ایک بے یقینی کی فضا قائم ہو گئی تھی کہ پارٹی کا آئین کونسا ہے ، الیکشن کب ہوئے ہیں، کس آئین کے تحت ہوئے ہیں وغیرہ۔ اس بے یقینی کے خاتمہ کیلئے الیکشن کمیشن آف پاکستان نے تحریک انصاف کے چیف الیکشن کمشنر جمال اکبر انصاری کو ملاقات کیلئے طلب کیا۔ اس ملاقات اوربعد میں الیکشن کمیشن میں اس کیس کی کاروائی کے دوران جمال اکبر انصاری نے استدعا کی کہ وہ مورخہ ۸ جون، ۲۰۲۲ کو پارٹی آئین میں کی گئی پہلی ترمیم اور اس بنیاد پر منعقد کئے گئے پارٹی انتخابات کے رزلٹ کو واپس لینا چاہتے ہیں اور الیکشن کمیشن نے اپنے ۲۸ مارچ ۲۰۲۳ کے آرڈر میں اس استدعا کو مان بھی لیا۔ اصولا پہلے والا الیکشن رزلٹ واپس لینے کے بعد تحریک انصاف کو اب نئے جمع کروائے گئے آئین کی بنیاد دوبارہ پارٹی الیکشن کروانا چاہیئے تھا، لیکن جب ایسا نہیں کیا گیا تو الیکشن کمیشن نے ۲ اگست، ۲۰۲۳ کو تحریک انصاف کو شو کاز نوٹس جاری کیا جس کے جواب میں پی ٹی آئی کے وکیل نے مورخہ ۲۴ اگست کو الیکشن کمیشن کے سامنے پیش ہو کر یہ مؤقف اپنایا کہ پی ٹی آئی کے چیف الیکشن کمشنر نے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ وہ پہلی ترمیم واپس لینا چاہتے ہیں بلکہ وہ صرف دوسری ترمیم یعنی جو نیا آئین جمع کروایا گیا تھا، کو واپس لینا جاہتے تھے، گو کہ الیکشن کمیشن اس دعوی سے متفق نہیں تھا لیکن پھر بھی اس کو مان لیا گیا۔

پہلی ترمیم کو واپس لینے کے مؤقف سے پیچھے ہٹنے کی وجہ سے خود کار طریقہ سے مبینہ طور پر ۱۰ جون، ۲۰۲۲ کو کروائے گئے پارٹی الیکشن کی حثییت بھی بحال ہوگئی جس کے متعلق تحریک انصاف کو قاعدے کے مطابق تمام معلومات و کاغذات الیکشن کمیشن کو بھی تک جمع کروانا باقی تھے۔

۱۰جون، ۲۰۲۲ کے پارٹی انتخابات اور پارٹی آئین میں پہلی ترمیم کا جائزہ :

اب چونکہ تحریک انصاف اپنا نیا جمع کروایا گیا آئین واپس لے چکی تھی ، تو ضروری ہو گیا تھا کہ الیکشن کمیشن پہلے اس بات کاجائزہ لے کہ کیا ۸ جون کو پارٹی آئین کے آرٹیکل ۵ کی شق نمبر ۵ میں مبینہ طور پر کی گئی ترمیم درست طریقے سے اور مجاز لوگوں نے کی تھی اور کیا اس ترمیم

کے بعد درست انداز میں پارٹی آئین کے مطابق الیکشن کروائے گئے، اسکے علاوہ کیا اس سارے عمل سے الیکشن کمیشن کو آگاہ کرتے وقت تمام قانونی تقاضوں کو پورا کیا گیا؟

1. اب تحریک انصاف کی پارٹی آئین میں مبینہ طور پر کی گئی ترمیم[مورخہ ۸ جون،۲۰۲۲] کیلئے جس بنیادی دستاویز پر عمل کرنا ضروری تھا، وہ پارٹی کا اپنا ہی آئین تھا اور اس آئین کے آرٹیکل ۱۶ کے مطابق ترمیم کرنے کا پارٹی کا مجاز ادارہ نیشنل کونسل کہلاتا ہے۔ اس ترمیم کے حوالے سے چند ایک حقائق ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

- ترمیم کرنے کا مجاز ادارہ جو ۲۰۱۷ کے پارٹی انتخابات میں منتخب ہوا تھا، کی میعاد ۱۳ جون ۲۰۲۱ کو پارٹی ایگزیکٹو کمیٹی کے ساتھ ختم ہو گئی تھی، اور اس کے بعد نہ ہی اس کو الیکشن ایکٹ ،۲۰۱۷ کی دفعہ ۲۰۸[۳] پر عمل کرتے ہوئے کبھی دوبارہ منتخب کیا گیا نہ ہی اس کی میعاد بڑھائی گئی۔ جبکہ مبینہ پہلی ترمیم ۸جون،۲۰۲۲ کو یعنی مجاز ادرے کی میعاد ختم ہونے کے پورے ایک سال بعد منظور کی گئی تھی، مطلب جس وقت ترمیم کی گئی ، اس وقت نیشنل کونسل کا ادارہ قانونی طور پر وجود ہی نہیں رکھتا تھا۔
- مزید یہ کہ پارٹی آئین کے آرٹیکل ۱۶ میں وضع کردہ، ترمیم سے متعلق طریقہ کار پر عمل کرنے کے ٹھوس شواہد اور کاغذات بھی نہیں پیش کئے گئے، جیسا کہ پارٹی ایگزیکٹو کمیٹی یا نیشنل کونسل نامی ادارہ کے ممبران کی جانب سے ترمیم کیلئے قرارداد کا پیش کرنا، اسکا دو تہائی کی اکثریت سے پاس ہونا، کونسل کی میٹنگ کے مقام، اس میں حاضر ممبران کی تسلی بخش لسٹ دینا وغیرہ شامل ہے۔

اس مندرجہ بالا حقائق کی بنا پر الیکشن کمیشن نے یہ قرار دیا کہ پارٹی آئین میں ۸ جون کو مبینہ طور پر ہونے والی ترمیم درست طریقے سے مجاز اشخاص نے نہیں کی ہے۔

2. الیکشن جس ترمیم کی بنیاد پر منعقد ہوئے، اس پر سوالیہ نشان لگنے کے بعد ایک بنیادی سوال یہ سامنے آیا کہ کیا اس ترمیم کے تحت ہونے والے مبینہ انتخابات درست قرار دیے جا سکتے ہیں؟ لیکن الیکشن کمیشن آف پاکستان نے اپنے اس آرڈر میں بنیادی

طور پر اس سوال پر غور کرنے کے بجائے اس بات پر فوکس کہ کیا پارٹی الیکشن اس غیر قانونی ترمیم کے بعد سچ میں ۱۰جون،۲۰۲۲ کو ہوئے بھی ہیں یا نہیں اور کیا الیکشن کمیشن کو قانونی طور پر وضع کردہ طریقہ کار اور میعاد کے اندر پارٹی نے آگاہ کیا یا نہیں؟ اس حوالے سے ریکارڈ پر موجود دستاویزات سے درج ذیل حقائق اخذ کئے گئے:

- پی ٹی آئی کے الیکشن کمشنر جمال اکبر انصاری، جو پارٹی انتخابات کروانے کے ذمہ دار تھے، نے الیکشن کمیشن آف پاکستان کو مختلف تاریخوں میں لکھے گئے دو خطوط میں انتخابات کے انعقاد کی تاریخ بالترتیب ۱۰ جون اور۷ جون ۲۰۲۲ درج کی تھی، جبکہ اپنے بیان حلفی میں انہوں نے یہ تاریخ ۹ جون،۲۰۲۲ لکھی تھی۔ اس کے علاوہ پی ٹی آئی کے موجودہ چیئرمین اور اس وقت پارٹی وکیل بیریسٹر گوہر علی خان نے الیکشن کمیشن کو لکھے گئے جواب میں انتخابات کے انعقاد کی تاریخ ۷ جون، ۲۰۲۲ بیان کی ہے۔
- الیکشن ایکٹ ،۲۰۱۷ کی دفعہ ۲۰۹ اور الیکشن رولز کے رول نمبر ۱۵۸ کے تحت، تحریک انصاف پابند تھی کہ پارٹی انتخابات ہونے کے ۷ دنوں کے اندر ، انتخابات سے متعلق الیکشن کمیشن کو مذکورہ دفعہ میں درج کاغذات[جیسے فارم ۶۵]، وضع کردہ اندازمیں الیکشن کمیشن کو جمع کرواتی لیکن کئی مواقع ملنے کے باوجود ۱ مہینے سے زیادہ تاخیر کے بعد مطلوبہ کاغذات مکمل طور پر جمع کروائے گئے۔

الیکشن کمیشن آف پاکستان کا فیصلہ:

مندرجہ بالا حقائق کی بنا پر جب یہ بات سامنے آئی کہ نہ ہی درست اور قانونی طریقے سے پارٹی آئین میں ترمیم کی گئی ہے، نہ ہی اس ترمیم کی بنیاد پر درست انداز میں الیکشن ہوئے ہیں یا شاید سرے سے ہوئے ہی نہیں ہیں، کیونکہ تاریخ انعقاد میں واضح تضاد موجود تھا، تو قانونی طور پر الیکشن ایکٹ،۲۰۱۷ کی دفعہ ۲۱۵[۵] کے تحت الیکشن کمیشن ، تحریک انصاف سے بلے کا انتخابی نشان واپس لے سکتی تھی لیکن ایک نرم رویہ اختیار کرتے ہوئے الیکشن کمیشن نے پی ٹی آئی کو

مزید ایک موقع فراہم کرتے ہوئے ۲۰ دنوں کے اندر پارٹی کے موجودہ آئین کے تحت دوبارہ الیکشن کروانے کا حکم دیا اور مقررہ میعاد کے اندر الیکشن کے انعقاد سے متعلق تمام کاغذات درست انداز میں الیکشن کمیشن کو جمع کروانے کا حکم دیا، بصورت دیگرمذکورہ دفعہ ۲۱۵[۵]کے تحت پارٹی کو بلے کے انتخابی نشان سے محروم کرنے کے ممکنہ نتیجہ سے آگاہ کیا۔

اس آرڈر کو الیکشن کمیشن کے خیبر پختونخواہ سے ممبر جسٹس ریٹائرڈ اکرام اللہ خان نے تحریر کیا ہے جس کو بہتر انداز میں سمجھنے کیلئے بہتر ہے کہ قاری کیس سے متعلقہ باقی آرڈرز اور کاراوئی کو بھی پڑھے۔

پی ٹی آئی کے پارٹی انتخابات و انتخابی نشان منسوخ کرنے سے متعلق الیکشن کمیشن کے دوسرے اہم آرڈر[مورخہ ۲۲ دسمبر،۲۰۲۳]کا خلاصہ[25]

محمد اسد[26]

پس منظر:

الیکشن کمیشن نے جب اپنے ۲۳ نومبر، ۲۰۲۲ کے آرڈر میں پی ٹی آئی کے ۱۰ جون، ۲۰۲۲ کو مبینہ طور پرکروائے گئے پارٹی انتخابات کو مختلف قانونی ضابطوں کی خلاف ورزی اور شکوک و شبہات کی بنیاد پر منسوخ کرتے ہوئے ۲۰ دنوں کے اندر دوبارہ قانون اور پی ٹی آئی پارٹی آئین کے مطابق الیکشن کروانے کا حکم دیا تو تحریک انصاف نے ۲ دسمبر،۲۰۲۳کو دوبارہ پارٹی انتخابات کروائے جس میں بیریسٹر گوہر علی خان پارٹی چیئرمین منتخب ہوئے۔

---

[25]اس آرڈر کو الیکشن کمیشن کے خیبر پختونخواہ سے ممبر جسٹس ریٹائرڈ اکرام اللہ خان نے تحریر کیا ہے اور اسے کیس نمبر۵[۱]آف۲۰۲۳کے تحت تلاش کیا جا سکتا ہے۔

[26]،طالب علم،ایل ایل بی، [شریعہ اینڈ لاء]انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی،ممبر آئین و قانون اورانہیں assadmuhammad623@gmail.com کے زریعے رابطہ کیاجاسکتا ہے۔

اس بار انتخابات سے متعلق کاغذات تو مقررہ وقت پر وضع کردہ قانونی طریقہ کار کے مطابق الیکشن کمیشن کو جمع کروا دیے گئے تھے لیکن الیکشن کمیشن آف پاکستان کے پولیٹیکل فائنانس ونگ اور پی ٹی آئی کے ایک درجن سے زائد باغی ارکان جن میں بانی رکن اکبر ایس بابر سرفہرست تھے، کے اٹھائے گئے اعتراضات و سوالات نے دوبارہ پارٹی انتخابات منسوخ کروا دیے۔ ذیل میں اس سب کی تفصیل بیان کی جا رہی ہے۔

کیس کے بنیادی حقائق و سوالات:

1. پی ٹی آئی پارٹی آئین کے آرٹیکل ۶[۹]کے مطابق پارٹی انتخابات کروانے کیلئے "پی ٹی آئی فیڈرل الیکشن کمیشن "نامی ادارے کا قیام عمل میں لایا جائے گا جو کہ چیف الیکشن کمیشن اور مختلف صوبوں سے لیے گئے چھ کمشنرز پر مشتمل ہوگا اور ان سب ارکان کے نام پارٹی آئین کے آرٹیکل ۹ کے تحت سیکٹری جنرل ، پارٹی چیئرمین اور سینٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کی منظوری کے بعد نیشنل کونسل سے وضع کردہ طریقے سے منظور کروائے گا۔ اب پارٹی آئین کے تحت منتخب ہونے والے پارٹی الیکشن کمشنر جمال اکبر انصاری تھے جنہوں نے ۲۳ نمبر۲۰۲۳کے منسوخ ہونےوالے پارٹی الیکشن بھی کروائے تھے اور ان کے عہدے کی مدت باقی تھی، لیکن پارٹی آئین کے بر خلاف ۲ دسمبر، ۲۰۲۳ کو پارٹی انتخابات نیاز اللہ نیازی نے بطور چیف الیکشن کمشنر کروائے۔ اس خلاف ورزی سے متعلق دستیاب ریکارڈ کی بنیاد پر درج ذیل حقائق الیکشن کمیشن کے سامنے آئے:

- دوران کیس ایسی کوئی دستاویز سامنے نہیں آئی جس کی بنیاد پر کہا جا سکے کہ آخری منتخب ہونے والے الیکشن کمشنر جمال اکبر انصاری نے یا تو استعفی دیا یا پارٹی آئین کے آرٹیکل ۹ کے تحت نیشنل کونسل نے اسکو عہدے سے ہٹایا ہو۔
- پارٹی آئین کے آرٹیکل ۹ کے تحت مذکورہ الیکشن کمشنر کا نام پارٹی کے سیکرٹری جنرل نیشنل کونسل سے منظور کرواتا ہے اور پارٹی آئین کے تحت سیکٹری جنرل اسد عمر تھے، لیکن نیاز اللہ نیازی[مبینہ پارٹی چیف الیکشن کمشنر] کی تقرری کے وقت نا صرف نیشنل کونسل اپنی میعاد ختم ہونے کی بنا پر غیر موجود تھی بلکہ انکی تعیناتی عمر ایوب نے بطور سیکرٹری جنرل کی تھی، جبکہ خود عمر ایوب کی تقرری بطور سیکرٹری جنرل مجاز

اتھارٹی کی جانب سے نہ ہوئی تھی یعنی قانونی نہ تھی۔ یاد رہے عمر ایوب کی تعیناتی گو کہ عمران خان نے۲۷مئی، ۲۰۲۳ کو کی تھی لیکن پی ٹی آئی کا اپنا آئین جو ۱ مئی، ۲۰۱۹ کو منظور کیا گیا تھا کے مطابق عمر ایوب کی بطور سیکرٹری جنرل تعیناتی صرف پارٹی چیف آرگنائزر کر سکتا تھا، لیکن چیف آرگنائزر کے عہدے پر کبھی کسی کو تعینات کیا ہی نہیں گیا تھا۔

- پارٹی آئین کے مطابق پارٹی انتخابات کا انعقاد اکیلا چیف الیکشن کمشنر نہیں کروانے کا مجاز نہیں جب تک باقی چھ کمشنرز اور پورا الیکشن کمیشن نہ ہو اور سارا انتخابی عمل ان کے مشورے اور رضا سے ہونا ضروری ہے، لیکن دستیاب ریکارڈ کے مطابق ۲ دسمبر کے پارٹی الیکشن کیلئے چیف الیکشن کمشنر نیاز اللہ کو اکیلے منتخب کیا گیا۔
- پی ٹی آئی کے وکیل نے گو کہ اس بات کو تسلیم کیا کہ نیاز اللہ نیازی کو آرٹیکل۹ میں دیے گئے طریقہ کار کے تحت منتخب نہ کیا گیا لیکن انہوں نے یہ مؤقف اختیار کیا کے" پی ٹی آئی رولز "کے رول نمبر ۲۸ کے تحت سیکرٹری جنرل بوقت ضرورت چیف الیکشن کمشنر تعینات کر سکتا ہے، لیکن الیکشن کمیشن کے مطابق ایک تو خود سیکرٹری جنرل عمر ایوب کی تعیناتی پارٹی آئین کے مطابق نہ تھی، دوسرا کوئی رول، آئین یا قانون کی کسی شق میں دیے گئے واضح طریقہ کارپر فوقیت حاصل نہیں کر سکتا، اور پی ٹی آئی کے آئین میں چیف الیکشن کمشنر کو ہٹانے، نیا لگانے کے واضح طریقہ کار پر رول نمبر۲۸ کے طریقہ کار کو فوقیت نہیں دی جا سکتی، نہ ہی پارٹی آئین کے تحت ایسے کوئی رولز بنانے کا اختیار کسی اتھارٹی کو دیا گیا ہے۔

2. اس کے علاوہ تحریک انصاف کے باغی ارکان کے مطابق پارٹی انتخابات خفیہ انداز میں، بنا کوئی اشتہار اخبار میں دیے یا پارٹی سیکرٹریٹ کے نوٹس بورڈ پر کوئی نوٹس لگائے اور انکو کاغذات نامزدگی کی فراہمی کئے بغیرمنعقد کئے گئے، جو کہ پارٹی آئین و قانون کی خلاف ورزی ہے۔یاد رہے کہ الیکشن ایکٹ ،۲۰۱۷کی دفعہ ۲۰۸[۲] کے تحت تمام پارٹی ممبرز کو پارٹی انتخابات میں حصہ لینے کی آزادی ہونی چاہیئے۔

الیکشن کمیشن کا فیصلہ:

مندرجہ بالا حقائق کی بنا پر الیکشن کمیشن نے یہ قرار دیا کہ تحریک انصاف ۲۳ نومبر، ۲۰۲۳ کو الیکشن کمیشن کی طرف سے دیے گئے آرڈر پر عمل کرنے اور اپنے پارٹی انتخابات الیکشن کمیشن ایکٹ ،۲۰۱۷ اور پارٹی آئین کے مطابق کروانے میں ناکام رہی ہے، اس لیے نہ صرف ۲ دسمبر، ۲۰۲۳کو تحریک انصاف کی طرف سے کروائے گئے انتخابات اور اس سے متعلق الیکشن کمیشن کو جمع کروائے گئے کاغذات مسترد کئے جاتے ہیں بلکہ الیکشن ایکٹ،۲۰۱۷ کی دفعہ ۲۱۵[۵]کے تحت اس کو انتخابی نشان لینے کے لیے بھی نا اہل قرار دیا جاتا ہے۔

عدالتی اختیار سماعت، الیکشن کمیشن کے اختیارات اور پی ٹی آئی کے پارٹی انتخابات سے متعلق پشاور ہائی کورٹ کا فیصلہ[27]

محمد اسد[28]

پس منظر و بنیادی حقائق:

۲۳ نومبر ۲۰۲۳ کو الیکشن کمیشن آف پاکستان نے اپنے ایک حکم نامے کے ذریعے مبینہ طور پر ۱۰ جون ۲۰۲۳ کروائے گئے پی ٹی آئی کے پارٹی انتخابات کو منسوخ قرار دینے سمیت دوبارہ ۲۰ دنوں کے اندر پی ٹی آئی کو دوبارہ پارٹی انتخابات کروانے کی ہدایت کی، جس پر عمل کرتے ہوئے پی ٹی آئی نے ۲ دسمبر ۲۰۲۳ کو پھر سے پارٹی انتخابات کروائے، لیکن الیکشن کمیشن نے ۲۲ دسمبر ۲۰۲۳ کو اپنے ایک حکم نامے کے ذریعے پارٹی الیکشن کمشنر، سیکٹری جنرل وغیرہ کا پارٹی آئین کے مطابق تعینات نہ ہونے اور پارٹی آئین کے مطابق الیکشن منعقد نہ کرنے جیسی مختلف اور بنیادوں پر، دوبارہ منعقد کئے گئے پارٹی انتخابات کو نہ صرف کالعدم قرار دیا بلکہ الیکشن کمیشن ایکٹ

---

[27] اس کیس کے مصنف جج جسٹس ارشد علی ہے اور اسے رٹ پیٹیشن نمبر ۶۱۷۳-پی آف ۲۰۲۳ کے طور پر تلاش کیا جاسکتا ہے۔

[28] ایل ایل بی، شریعہ اینڈ لاء (انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد) و ممبر آئین و قانون اور انہیں assadmuhammad623@gmail.com کے ذریعے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

،۲۰۱۷ کے دفعہ ۲۱۵[۵] کے تحت پی ٹی آئی کو بلے کے انتخابی نشان سے بھی محروم کر دیا۔اس حکم نامے کو پی ٹی آئی نے پشاور ہائی میں بذریعہ رٹ پٹیشن چیلنج کیا۔

بنیادی سوالات:

1. جب ناصرف الیکشن کمیشن کا ہیڈ آفس، بلکہ ۲ دسمبر، ۲۰۲۳ کا چیلنج شدہ آرڈر بھی اسلام آباد میں ہی دیا گیا ہے، جہاں پشاور ہائی کورٹ علاقائی دائرہ اختیار نہیں رکھتا، تو کیا ایسی صورتحال میں پشاور ہائی کورٹ اس پٹیشن کو سن سکتا ہے؟
2. الیکشن کمیشن جو کہ ایک آئینی ادارہ ہے، کے احکامات عدالت میں زیر غور آسکتے ہیں؟
3. کیا الیکشن کمیشن، آئین پاکستان یا الیکشن ایکٹ، ۲۰۱۷ کے تحت پی ٹی آئی کے پارٹی انتخابات کی چھان بین کرنے، اس پر اعتراض یا اس سے متعلق کوئی فیصلہ سنانے کا اختیار رکھتا تھا؟

تحریک انصاف کے وکلاء کے دلائل:

1. پی ٹی آئی (پٹیشنر/مدعی) کے وکلاء کے مطابق الیکشن کمیشن (مدعاعلیہ) کا مذکورہ آرڈر آئین پاکستان کے آرٹیکل ۱۷ میں درج سیاسی پارٹی کو بنانے یا اسکا حصہ بننے سمیت اس آئینی حق سے اخذ ہونے والے اور حقوق جیسے سیاسی پارٹی چلانا یا اپنے ووٹرز کی آسانی کیلئے مشترکہ انتخابی نشان کے حصول جیسے حقوق کی خلاف ورزی بھی کر رہا ہے۔اس مؤقف کے حق میں سپریم کورٹ کے فیصلوں[29] کو پیش کیا گیا۔
2. الیکشن کمیشن آف پاکستان اپنے محدود دائرہ اختیار کی بنا پر پی ٹی آئی کے پارٹی انتخابات پر سوالات، اعتراضات اٹھانے یا اسکی چھان بین کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔
3. چیلنج شدہ آرڈر میں چونکہ الیکشن کمیشن نے پارٹی انتخابات کے انعقاد سے انکار کے بجائے محض قانونی طور پر اختیار نا رکھنے والے اشخاص کی طرف سے پارٹی انتخابات کروانے کا دعوی کیا ہے، لہذا عدالتی نظائر میں تسلیم شدہ رول[30] یعنی [نتائج کو متاثر نہ کرنے والی][31] سطحی خلاف ورزیوں کو نظر انداز کرنے کی نظریہ کی بنا پر اس خلاف ورزی کو بھی معاف کیا جاسکتا ہیں۔

---

[29] پی ایل ڈی، ۱۹۸۹ سپریم کورٹ صفحہ ۶۶، پی ایل ڈی ۱۹۸۸ سپریم کورٹ صفحہ ۴۱۶۔

[30] Rule

[31] Defective Doctrine Rule

4. پی ٹی آئی کی طرح اور سیاسی پارٹیاں بھی پارٹی انتخابات نہیں کروا سکی لیکن الیکشن کمیشن نے ان کے خلاف ایسا کوئی قدم نہ اٹھا کر نہ صرف آئین پاکستان کے آرٹیکل ۲۵، جو سب سے یکساں سلوک کرنے کی تلقین کرتا ہے، کی خلاف ورزی کی ہے بلکہ یہ دوھرا معیار مذکورہ آرڈر کا نیک نیتی سے پاس نہ ہونا بھی ثابت کرتا ہے۔

الیکشن کمیشن کے وکلاء کے دلائل:

1. آئین کے آرٹیکل ۲۱۸[۳]، ۲۱۹ اور الیکشن ایکٹ ۔۲۰۱۷ سے اختیارات کشید کرنے کی بنیاد پر الیکشن کمیشن عام انتخابات سمیت پارٹی انتخابات کی نگرانی کے اختیارات بھی رکھتا ہے۔
2. الیکشن ایکٹ، ۲۰۱۷ کے تحت چونکہ پارٹی انتخابات، پارٹی آئین کے مطابق کروانا ضروری ہیں تو اس بات کو یقینی بنانے اور اس حوالے سے خود کو مطمئن کرنا کہ پارٹی الیکشن، پارٹی آئین کے مطابق ہوئے ہیں، الیکشن کمیشن کے دائرہ اختیار میں آتا ہے۔
3. چونکہ پی ٹی آئی کی طرف سے اسی نوعیت کی ایک رٹ پٹیشن نمبر ۲۸ آف ۲۰۲۴ لاہور ہائی کورٹ میں دائر کی جانے بعد خارج کر دی گئی ہے، اور جس کی انٹرا کورٹ اپیل پر ابھی تک فیصلہ ہونا باقی ہے، اس لیے ایک قانونی اصول[32]، یعنی اگر قانونی طور پر بااختیار کسی عدالت میں ایک کیس زیر سماعت ہو، تو دوسری عدالت، باجود اختیار سماعت رکھنے کے، اس مخصوص کیس کو سننے سے گریز کرے اور اس پہلی عدالت کو فیصلہ کرنے دے، کی بنیاد پر پشاور ہائی کورٹ اس کیس کو نہیں سن سکتی۔
4. حنیف عباسی کیس [33] میں چونکہ الیکشن کمیشن کیلئے پارٹی فنڈنگ کے حوالے سے حقائق، معلومات جمع کرنے کا اختیار تسلیم کیا گیا ہے، جس سے فطری طور پر پارٹی آئین کے مطابق پارٹی انتخابات کے منعقد ہونے سے متعلق، الیکشن کمیشن کے پاس ثبوت جمع کرنے کا اختیار بھی آجاتا ہے۔ جبکہ اسی

[32] Doctrine of Proprietary:

[33] پی ایل ڈی، ۲۰۱۸ سپریم کورٹ صفحہ ۱۸۹۔

مذکورہ کیس کی بنیاد پر اسلام آباد ہائی کورٹ نے ایک کیس [34] میں پارٹی انتخابات کی صداقت کو جانچنے اور اعتراض اٹھانے کا الیکشن کمیشن کا حق تسلیم کیا ہے۔

5. الیکشن کمیشن ایک آئینی ادارہ ہونے کی بنا پر اپنے کام کے حوالے سے مکمل بااختیار اور آزاد ہے، اور اپنی آئینی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے دوران دیے گئے اسکے احکامات عدالتی نظر ثانی کے تابع نہیں ہیں، جب تک آرڈر میں واضح طور پر کوئی قانونی سقم موجود نہ ہو۔

6. الیکشن کمیشن کے اسلام آباد میں واقع ہونے اور مذکورہ آرڈر کے اسلام آباد سے جاری کیے جانے کی وجہ سے پشاور ہائی کورٹ اس پٹیشن کو سننے کیلئے درکار علاقائی دائرہ اختیار چونکہ نہیں رکھتا، پس پشاور ہائی کورٹ اس کیس کو نہیں سن سکتا۔

بنیادی سوالات واعتراضات پر عدالتی جوابات:

1. پشاور ہائی کورٹ کے اختیار سماعت سے متعلق پہلے بنیادی سوال اور الیکشن کمیشن کے اعتراض کے جواب میں عدالت نے مختلف نظائر کی بنیاد پر یہ مؤقف اپنایا کہ آئین یا وفاقی قانون کے تحت بنایا گیا کوئی ادارہ، چاہے اسکا کام آئینی نوعیت کا ہو یا وفاق سے متعلق ہو، اور قطع نظر اس بات کے، کہ اسکا ہیڈ آفس کس جگہ پر ہے، اگر اس کے کسی حکم/عمل سے کسی صوبے کا شخص یا اشخاص متاثر ہو رہے ہوں، یا اسکا آرڈر جس واقعہ سے متعلق ہو، وہ کسی صوبے میں وقوع پزیر ہوا ہو، تو اس صوبے کی ہائی کورٹ مذکورہ ادارے کے اس آرڈر/عمل سے متعلق اختیار سماعت کا رکھتی ہے۔ چونکہ الیکشن کمیشن کے چیلنج شدہ آرڈر سے نہ صرف صوبہ خیبر پختونخواہ کے باسی جیسے پی ٹی آئی کے نئے منتخب ہونے والے چیئرمین اور عام عوام وغیرہ متاثر ہوئے ہیں بلکہ مذکورہ پارٹی انتخابات بھی خیبر پختونخواہ میں منعقد ہوئے ہیں، پس پشاور ہائی کورٹ اس پٹیشن کو سن سکتی ہے۔

2. پشاور ہائی کورٹ کے اختیار سماعت کو، لاہور ہائی کورٹ میں اسی نوعیت کی پٹیشن خارج ہونے اور اب انٹرا کورٹ اپیل کے مرحلے پر زیر سماعت ہونے کی بنا پر چیلنج کرنے سے متعلق الیکشن کمیشن کے وکلاء کی دلیل، کو عدالت نے اس بنیاد پر رد کیا کہ لاہور ہائی کورٹ میں دائر کی جانے والی مذکورہ پٹیشن نمبر ۲۸۷ آف ۲۰۲۴ سے پہلے ہی اسی معاملے سے متعلق پی ٹی آئی نے پٹیشن نمبر ۵۹۱-پی آف

[34] پی ایل ڈی، ۲۰۱۸ اسلام آباد صفحہ ۳۰۰۔

۲۰۲۳ پشاور ہائی کورٹ میں دائر کر دی تھی، اور لاہور ہائی کورٹ نے بھی میرٹ کے بجائے اس وجہ کی بنیاد پر، پٹیشن نمبر ۲۸۷ آف ۲۰۲۴ کو خارج کیا تھا۔

3. بنیادی سوال نمبر ۲ کے حوالے سے عدالت نے ایک فیصلے[35] کی بنیاد پر یہ قرار دیا کہ ایک آزاد اور آئینی ادارہ ہونے کی بنا پر، الیکشن کمیشن کے احکامات اگر آئین اور قانون کے مطابق ہوں تو اس حوالے سے عدالت کم سے کم مداخلت کرے گی، لیکن اگر احکامت قانونی دائرہ اختیار سے باہر ہوں یا اس میں بدنیتی کا عنصر شامل ہو، تو عدالت اس میں مداخلت کر سکتی ہے۔

4. سب سے اہم بنیادی سوال، کہ کیا الیکشن کمیشن، پارٹی انتخابات کی چھان بین کرنے، اس پر اعتراض یا فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے، کا جواب دینے سے پہلے عدالت نے آئین کے آرٹیکل ۲۱۸[۳] اور ۲۱۹[ای] سمیت الیکشن ایکٹ، ۲۰۱۷ کی مختلف دفعات جیسے ۲۱۰، ۲۰۹، ۲۰۲ وغیرہ کا بغور جائزہ لیا اور یہ قرار دیا، کہ مختلف عام انتخابات کے انعقاد کو صاف شفاف طریقے سے ممکن بنانے کی خاطر گو کہ، آئین کے مذکورہ آرٹیکلز نے الیکشن کمیشن کو کئی اختیارات دیے ہیں، لیکن آئین سمیت الیکشن ایکٹ، ۲۰۱۷ میں کہیں پر بھی الیکشن کمیشن کو پارٹی انتخابات کی چھان بین کرنے، اعتراض کرنے کے اختیارات نہیں دیے گئے، بلکہ جب کوئی سیاسی پارٹی، پارٹی انتخابات کے انعقاد کیے جانے کے بعد متعلقہ سرٹیفکیٹ الیکشن کمیشن کو جمع کروادے تو قانونی طور پر الیکشن کمیشن پابند ہے کہ وہ اسکو اپنی ویب سائیٹ پر شائع کرے۔ اپنے اس مؤقف کے حق میں سپریم کورٹ کے فیصلے[36] کو بطور نظیر پیش کیا گیا۔

5. اسکے علاوہ عدالت نے یہ قرار دیا کہ الیکشن ایکٹ، ۲۰۱۷ کی دفعہ ۲۱۵[۵]، کے تحت کسی سیاسی پارٹی کو انتخابی نشان سے تب ہی محروم کیا جا سکتا ہے جب وہ اس ایکٹ کی دفعہ ۲۰۹ اور ۲۱۰ پر عمل درآمد میں ناکام رہے، یعنی یا تو پارٹی انتخابات کے انعقاد یا پارٹی فنڈز و اکاؤنٹس سے متعلق سرٹیفکیٹ الیکشن کمیشن کو نہ جمع کروا سکے، کیونکہ کسی پارٹی کو انتخابی نشان سے محروم کرنا، آئین کے آرٹیکل ۱۷ میں

---

[35] ۲۰۱۸ ایس۔ سی۔ ایم۔ آر صفحہ ۱۱۸۳۔

[36] ۱۹۹۹ ایس، سی، ایم آر، صفحہ ۱۹۲۱

درج آئینی حقوق جیسے پارٹی بنانا، چلانا یا اس میں شامل ہونے کے ساتھ اس آئینی حق سے اخذ ہونے والے اور حقوق کی خلاف ورزی کے مترادف ہے۔

عدالتی فیصلہ:

مندرجہ بالا بحث اور جوابات کی بنیاد پر پشاور ہائی کورٹ نے الیکشن کمیشن کے ۲۲ دسمبر، ۲۰۲۳ کے حکم، جس میں پی ٹی آئی کے پارٹی انتخابات کالعدم قرار دیا گیا تھا، کو منسوخ کرنے کے ساتھ، الیکشن کمیشن کو حکم دیا کہ وہ الیکشن ایکٹ، ۲۰۱۷ کی دفعہ ۲۰۹ کے تحت جمع کروائے گئے سرٹیفکیٹ کو اپنی ویب سائیٹ پر شائع کرے جبکہ تحریک انصاف کو بلے کے انتخابی نشان کے لیے بھی اہل قرار دیا گیا۔

تحریکِ انصاف کے انتخابی نشان سے متعلق سپریم کورٹ کے تین رکنی بینچ کا فیصلہ [37]

قاسم اقبال جلالی [38]

کیس کا پس منظر:

الیکشن کمیشن کو تحریکِ انصاف (جماعت) کے انٹرا پارٹی الیکشن سے متعلق ۱۴ شکایات موصول ہوئیں، نیز الیکشن کمیشن کے پولیٹیکل فنانس ونگ نے بھی مذکورہ الیکشن پہ اعتراض اٹھایا جس کی بنیاد پہ کمیشن نے ۲ ۲ دسمبر ۲۰۲۳ کو جماعت کے الیکشن مسترد کر دیئے اور انتخابی نشان "بلا" واپس لے لیا۔ اس فیصلے کے خلاف جماعت نے رِٹ پٹیشن کے ذریعے پشاور ہائی کورٹ سے رجوع کیا جس نے ۱۰ جنوری ۲۰۲۴ کو کمیشن کا مذکورہ فیصلہ خلافِ قانون و آئین قرار دیتے ہوئے منسوخ کر دیا اور انتخابی نشان بحال کر دیا۔

---

[37] اس فیصلے کے مصنف جج جسٹس قاضی فائز عیسی ہے، ان کے ساتھ بینچ میں جسٹس محمد علی مظہر اور جسٹس مسرت حلالی شامل ہے۔ اس فیصلے کو سول پیٹیشن نمبر ۴۲ آف ۲۰۲۴ کے طور پر تلاش کیا جا سکتا ہے۔

[38] ایڈووکیٹ ہائی کورٹ۔ انہیں jalali388@gmail.com کے ذریعے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

پشاور ہائی کورٹ کے اِس فیصلے کے خلاف الیکشن کمیشن نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی جسے چیف جسٹس آف پاکستان سمیت تین رکنی بینچ نے سُنااور ۱۱ جنوری ۲۰۲۴ کو پشاور ہائی کورٹ کا فیصلہ کلعدم قرار دیتے ہوئے الیکشن کمیشن کا فیصلہ بحال رکھااور جماعت کو انتخابی نشان سے محروم کر دیا گیا۔

فیصلے کے مندرجات اور بیان کردہ وجوہات:

فیصلے کے آغاز میں ہی چیف جسٹس نے پاکستان تحریک انصاف کے بانی رکن، پاکستان تحریک انصاف آئین کے ایک خالق اوراِس کیس میں جماعت کے وکیل جناب حامد خان سینئر ایڈووکیٹ سپریم کورٹ کا اپنا ایک قول نقل کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ایک سیاسی جماعت کے اندر ہر لیول پہ انٹرا پارٹی الیکشن، وہ بھی خفیہ رائے شماری کے ذریعے، ہونے چاہئیں تاکہ سیاسی جماعتیں اپنے لیڈران کی یرغمال نہ بن جائیں۔

اس کے بعد عدالت نے الیکشن ایکٹ، ۲۰۱۷ کے دفعہ ۲۰۱ کا حوالہ دیا ہے جس کے تحت ہر سیاسی جماعت کو اپنا آئین تشکیل دینے کا اختیار حاصل ہے جبکہ دفعہ ۲۰۸ کے تحت سیاسی جماعت پہ لازم ہے کہ وہ انٹرا پارٹی الیکشن کروائے. جماعت پہ لازم ہے کہ الیکشن کے بعد وہ دفعہ ۲۰۹ کے تحت ایک سرٹیفکیٹ کمیشن میں جمع کروائے کہ انٹرا پارٹی الیکشن مذکورہ جماعت کے آئین اور الیکشن ایکٹ کے مطابق ہوئے ہیں۔ پھر عدالت نے دفعہ ۲۱۵ کا حوالہ دیا ہے جس کی ذیلی دفعہ ۴-۵ میں کہا گیا ہے کہ اگر کوئی جماعت دفعہ ۲۱۰ اور ۲۰۹ کو پورا نہیں کرتی تو اسے شوکاز نوٹس دینے اور صفائی کا موقع دینے کے بعد انتخابی نشان سے محروم کیا جا سکتا ہے۔اس کے بعد عدالت نے تحریکِ انصاف کے اُن اعتراضات کو لیا ہے جس میں الیکشن کمیشن کی جانبداری، بدنیتی اور قانون کے غیر مساوی اطلاق کی بات کی گئی ہے۔

عدالت نے کہا ہے کہ الیکشن کمیشن نے ۲۴ مئی ۲۰۲۱ کو تحریکِ انصاف کو انٹرا پارٹی الیکشن بارے خط لکھا لیکن جواب نہ دیا گیا۔ پھر جولائی ۲۰۲۱ میں شوکاز نوٹس جاری کیا گیا جسکے جواب میں جماعت نے تسلیم کیا کہ جماعت کے آئین کے مطابق ۵ سال کے اندر انتخابات نہیں کروائے گئے۔ چنانچہ ایک سال کا وقت مانگا گیا جو ۲۴ اگست ۲۰۲۱ کو دے دیا گیا۔ عدالت نے قرار دیا کہ ۲۰۲۱ میں جماعت مرکز اور دو صوبوں میں حکومت کر رہی تھی اس لئے الیکشن کمیشن پہ جانبداری کا الزام سمجھ سے بالاتر ہے۔

ایک سال مزید وقت دینے کے باوجود جب الیکشن منعقد نہ ہوئے تو ۲۷ مارچ ۲۰۲۳ کو ایک مزید نوٹس جاری کر کے جماعت کو متنبہ کیا گیا، ۱۶ اپریل ۲۰۲ کو ایک مزید نوٹس دیا گیا لیکن اس پہ بھی عمل نہ ہوا، چنانچہ ۲۱ مئی ۲۰۲، کو حتمی نوٹس بابت انٹرا پارٹی الیکشن دیا گیا۔ جماعت نے جواباً لکھا کے انٹرا پارٹی الیکشن ۸ جون، ۲۰۲۲ کو منعقد

ہو چکے ہیں۔ الیکشن کمیشن نے مذکورہ الیکشن کو مسترد کر دیا، جس کی الگ وجوہات ہیں، جس کے بعد متعدد مزید نوٹسز بابت انٹرا پارٹی الیکشن جماعت کو جاری کئے گئے۔

آخر کار ۱۲ اگست ۲۰۲۳ کو الیکشن کمیشن نے انٹرا پارٹی الیکشن کیلئے نوٹس جاری کیا، جس پہ عمل نہ ہونے کے باعث ۱۳ ستمبر ہو فیصلہ محفوظ کیا گیا اور ۲۳ نومبر، ۲۰۲۳ کو فیصلہ جاری کرتے ہوئے جماعت کو حکم دیا کہ ۲۰ دن کے اندر انٹرا پارٹی الیکشن کروایا جائے۔ چنانچہ جماعت نے ۲ دسمبر ۲۰۲۳ کو الیکشن کروانا بیان کیا جس پہ اعتراض کنندگان نے کہا کہ مذکورہ الیکشن منعقد ہی نہیں ہوئے۔ اس بابت الیکشن کمیشن میں شکایات جمع کروائی گئیں جن پہ الیکشن کمیشن نے سماعت کی اور ۲۲ دسمبر ۲۰۲۳ کو متفقہ فیصلہ سنایا جماعت انٹرا پارٹی الیکشن کروانے میں ناکام رہی ہے چنانچہ اس سے انتخابی نشان واپس لیا جاتا ہے۔

عدالت نے پھر اس سوال کا جواب دیا ہے کہ کیا الیکشن کمیشن نے تحریک انصاف کو مناسب موقع دیا یا نہیں؟ اور نوٹس جاری کئے یا نہیں؟ اس بابت عدالت نے تمام نوٹسز کا ایک ایک کر کے حوالہ دیا اور قرار دیا کہ الیکشن کمیشن نے جماعت کو صفائی پیش کرنے اور الیکشن کروانے کا بھرپور موقع دیا۔

پھر عدالت نے انٹرا پارٹی الیکشن سے متعلق الیکشن کمیشن کے احکامات کو جماعت کی طرف سے عدالتوں میں چیلنج کرنے کے بارے میں تفصیلات بیان کی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ پہلی رٹ پٹیشن لاہور ہائی کورٹ میں دائر کی گئی جس میں استدعا کی گئی کہ ۸ جون ۲۰۲۲ کو ہونے والے انٹرا پارٹی الیکشن کو درست قرار دیتے ہوئے الیکشن کمیشن کو کسی کارروائی سے روکا جائے. جو ایک رکنی بینچ سے پانچ رکنی بینچ کو منتقل ہوئی جو سپریم کورٹ میں سماعت کے وقت تک زیر سماعت تھی اور اُس میں قابل سماعت ہونے سے متعلق بھی اب تک فیصلہ نہ ہوا تھا۔ دوسری رٹ پٹیشن پشاور ہائی کورٹ میں دائر کی گئی جس میں ۲ دسمبر کے الیکشن کو درست قرار دینے اور الیکشن کمیشن کو کارروائی سے روکنے کی استدعا کی گئی۔ جبکہ الیکشن کمیشن کے ۲۲ دسمبر کے حکم کے خلاف پھر لاہور ہائی کورٹ سے رجوع کر لیا گیا، جس میں انتخابی نشان واپس لینے کے فیصلے کو کالعدم قرار دینے کی استدعا کی گئی، یہ رٹ پٹیشن لاہور ہائی کورٹ نے خارج کر دی. جس کے خلاف انٹرا کورٹ دائر کی گئی اور وہ بھی خارج کر دی گئی۔ اسی طرح کی پانچویں رٹ پھر پشاور ہائی کورٹ میں دائر کی گئی جس میں انتخابی نشان واپس لینے کا الیکشن کمیشن کا حکم کالعدم قرار دینے کی استدعا کی گئی۔

اس پس منظر میں عدالت نے اس سوال کا جائزہ لیا کہ کیا ایک پارٹی ایک ہی کیس کو دو مختلف عدالتوں میں دائر کر سکتی ہے؟ عدالت نے اسکا جواب، مجموعہ ضابطہ دیوانی کی دفعہ ۱۰ اور صلاح الدین ترمزی کیس[39] کی رُو سے، نفی میں دیا ہے۔ آگے چل کے عدالت نے آرٹیکل ۱۷، آئین کے دیباچے اور قرارداد مقاصد کا حوالہ دے کر کہا ہے کہ جمہوریت کو ہمارے آئینی سٹرکچر میں انتہائی اہم مقام دیا گیا ہے۔ لہذا اگر جماعتوں کے اندر الیکشن نہیں ہونگے تو جماعتیں مقصدیت کے بجائے محض نام رہ جائیں گی۔

عدالت نے ۱۴ شکایت کنندگان کے متعلق لکھا ہے کہ اِن کی جماعت سے طویل وابستگی ہے جسے انہوں نے جھٹلائی نہ جائے سکنے والی اسناد سے ثابت کیا ہے لہذا ایسی وابستگی کو زبانی انکار سے رد نہیں کیا جاسکتا۔ مزید یہ کہ اکبر ایس بابر نے متعدد دستاویزات اور ایک عدالتی حکم کے ذریعے جماعت سے وابستگی ثابت کی ہے۔

پھر عدالت نے اِس نکتے کو اٹھایا ہے کہ ہم نے تحریکِ انصاف سے بارہا یہ پوچھا کہ ہمیں دستاویزات اور شواہد سے صرف اتنا دکھا دیجیے کہ الیکشن، یا الیکشن سے ملتی جلتی کو کارروائی عمل میں لائی گئی ہو لیکن متعدد موقع کے باوجود وکلاء ایسا کچھ بھی ریکارڈ پہ نہ لا سکے۔ حتّٰی یہ پشاور ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں دائر پٹیشن کے ساتھ بھی ایسا کوئی ریکارڈ منسلک نہیں ہے۔ الیکشن کمیشن اور اکبر ایس بابر کے وکلاء نے نشاندہی کی کہ نہ تو نامزدگی فارم موجود ہیں، نہ اُن ۱۹۱ افراد کے نامزدگی فارم موجود ہیں جو تحریک انصاف کے مطابق انٹرا پارٹی الیکشن میں کھڑے ہوئے، نہ ان ۹۱ افراد کے بارے میں کوئی عوامی نوٹس موجود ہے کہ کون کس سیٹ کیلئے کھڑا ہے، ایسا کوئی ثبوت بھی موجود نہیں جس سے پتہ چلے کہ مذکورہ افراد کے علاوہ کسی نے خود کو الیکشن کیلئے پیش نہیں کیا۔ الیکشن کی جگہ کے متعلق بھی پارٹی ممبران کو کوئی پبلک نوٹس نہیں دیا گیا. نہ ہی پارٹی آئین کے مطابق انٹرا پارٹی الیکشن لڑنے والے ممبران کا ۵۰، ۵۰ ہزار روپے پارٹی فنڈ میں جمع کروانے کا کوئی ثبوت موجود ہے۔ مذکورہ الیکشن فنڈ کے مبلغ ۴۵ لاکھ ۵۰ ہزار روپے پارٹی کے اکاؤنٹ میں جمع کروانے جانے کا بھی کوئی ثبوت موجود نہیں، الیکشن شیڈول سے متعلق پبلک نوٹس بھی نہیں دِیا گیا اور نہ ہی الیکشن ووٹنگ کیلئے جگہ سے متعلق پبلک نوٹس دیا گیا ہے. عدالت نے لکھا ہے کہ مذکورہ نکات کی بابت تحریکِ انصاف کے وکلاء کوئی وضاحت نہ پیش کر سکے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انٹرا پارٹی الیکشن منعقد ہی نہیں ہوئے۔

---

[39] [پی ایل ڈی ۲۰۰۸ سپریم کورٹ صفحہ ۷۳۵]

عدالت نے لکھا ہے کہ انٹرا پارٹی الیکشن نہ کروانے کا مطلب ہے کہ جماعت نے اپنے ۸ لاکھ سے زائد ممبران کو حقِ نمائندگی سے محروم کر دیا ہے، جو آرٹیکل ۱۷[بی] اور بے نظیر بھٹو کیس کی خلاف ورزی ہے۔

فاضل وکیل حامد خان نے الیکشن کمیشن کی اپیل کے قابلِ سماعت ہونے پہ جو اعتراض اٹھایا اسے مسترد کرتے ہوئے عدالت نے لکھا کہ الیکشن کمیشن ایک آئینی ادارے ہے اور صلاح الدین ترمذی اور حنیف عباسی کیس کی روشنی میں الیکشن کمیشن اپیل دائر کر سکتا ہے۔ عدالت نے لکھا ہے کہ مذکورہ قانونی حوالوں کے رد میں فاضل وکیل کوئی کیس لاء پیش نہیں کر سکے۔

الیکشن کمیشن کی بدنیتی سے متعلق نکتے پہ عدالت نے کہا کہ ہے کہ واقعاتی بدنیتی کا الزام وکلاء نے واپس لے لیا جبکہ قانونی بدنیتی کا سوال اس لئے پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اسی نوعیت کے نوٹسز دیگر جماعتوں کو بھی جاری کیے گئے۔ اور جب تحریک انصاف سے الیکشن کے متعلق پوچھا گیا تب وفاق اور ۲ صوبوں میں ان کی اپنی حکومت تھی۔ لہذا اس اعتراض کو رد کر دیا گیا۔

اس کے بعد عدالت نے آئین کے مختلف آرٹیکلز ۲۱۳ تا ۲۲۶، پرانے اور نئے الیکشن قوانین کی روشنی میں الیکشن کمیشن کی ذمہ داریوں اور اختیارات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور قرار دیا ہے کہ الیکشن کمیشن نے تحریکِ انصاف کو انٹرا پارٹی الیکشن کروانے کیلئے بھرپور اور متعدد مواقع دیئے گئے اور بار ہا نوٹسز جاری کیے گئے لہذا عدم تعمیل کی صورت میں الیکشن کمیشن کا فیصلہ قانون کے مطابق ہے. نیز عدالت نے یہ دلیل بھی رد کر دی کہ انٹرا پارٹی الیکشن کے متعلق پوچھنا یا جرمانہ کرنا آئین کے آرٹیکل ۱۷ کی خلاف ورزی ہے۔ بیرسٹر علی ظفر کی دلیل تھی کہ چونکہ آرٹیکل ۱۷ میں سے انٹرا پارٹی الیکشن کی بات نکال دی گئی ہے لہذا انٹرا پارٹی الیکشن اب آئین کا تقاضا ہی نہیں ہیں اور یوں مذکورہ الیکشن کی عدم موجودگی میں انتخابی نشان واپس لینا درست نہیں۔ عدالت نے اس دلیل کو یہ کہتے ہوئے رد کر دیا کہ آرٹیکل ۱۷ سے یہ بات بھی نکال دی گئی تھی کہ سیاسی جماعتیں نفرت اور دشمنی کو پروان نہیں چڑھائیں گی لیکن اسکا یہ مطلب نہیں کہ اب سیاسی جماعتوں کو نفرت اور دشمنی پھیلانے کی اجازت دے دی گئی ہے۔

چونکہ دونوں طرف کے وکلاء نے بے نظیر بھٹو کیس [40] پہ انحصار کیا تھا اس لئے عدالت نے اس مقدمے کا بھی تفصیلی جائزہ لیا اور اسکا پسِ منظر، اس میں اٹھائے گئے قانون و آئینی نکات بتانے کے بعد قرار دیا کہ حالیہ کیس بے نظیر بھٹو کیس سے مختلف ہے جس کی عدالت نے پانچ مختلف وجوہات بیان کی ہے۔

---

[40] [پی ایل ڈی ۱۹۸۹ سپریم کورٹ صفحہ ۶۶]

عدالت نے آگے چل کے قرار دیا ہے کہ انتخابی نشان سے محرومی کی مکمل ذمہ داری اُن افراد پہ عائد ہوتی ہے جو جماعت میں الیکشن نہیں کروانا چاہتے تھے اور جماعت کے اعلیٰ عہدوں پہ براجمان ہو کر جماعت کو جمہوریت کے بجائے آمریت سے چلانا چاہتے تھے. عدالت نے انٹرا پارٹی الیکشن کی اہمیت کو اجاگر کرنے کیلئے امریکی سپریم کورٹس برطانیہ کی کنزرویٹو پارٹی کا بھی حوالہ دیا۔

اس کے بعد عدالت نے زیرِ اعتراض پشاور ہائی کورٹ کے فیصلے میں موجود قانونی نقائص اور تضادات کی نشاندہی کی ہے جس میں ایک طرف تسلیم کیا گیا کہ الیکشن کمیشن کو معاملے کی سماعت کا اختیار تھا اور دوسری جانب الیکشن کمیشن کے فیصلے کو "بغیر قانونی اختیار" کے قرار دے دیا گیا. عدالت نے پشاور ہائی کورٹ کی اس دلیل کو رد کر دیا کہ قانون صرف انٹرا پارٹی الیکشن کا سرٹیفکیٹ جمع کروانے کا حکم دیتا ہے اور کہا کہ الیکشن ایکٹ کے دفعہ ۲۰۹ کے تحت الیکشن کا منعقد ہونا بھی ضروری ہے اور اسے دیکھنا الیکشن کمیشن کی ذمہ داری ہے ورنہ الیکشن کروائے بنا سرٹیفکیٹ جمع کروانا بذاتِ خود دھوکہ دہی کے زمرے میں آئے گا۔ سپریم نے قرار دیا کہ پشاور ہائی کورٹ نے اس بات کو بھی نظرانداز کیا ہے کہ یہی معاملہ لاہور ہائی کورٹ میں زیر سماعت ہے، نیز مجموعہ ضابطہ دیوانی کی دفعہ ۱۰ کو بھی نظرانداز کیا گیا ہے جس کے مطابق ایک ہی معاملہ دو مختلف عدالتوں میں نہیں چلایا جا سکتا۔

خلاصہ:

لہذا اِن سب "دلائل" کی روشنی میں عدالت نے قرار دیا کہ تحریکِ انصاف، بار بار نوٹسز اور وقت دیئے جانے کے باوجود، انٹرا پارٹی الیکشن کروانے میں ناکام رہی ہے۔ لہذا الیکشن کمیشن کا فیصلہ برقرار رکھا جاتا ہے جس کے تحت تحریکِ انصاف سے انتخابی نشان واپس لے لیا گیا تھا۔ پشاور ہائی کورٹ کا فیصلہ کالعدم قرار دیتے ہوئے الیکشن کمیشن کی اپیل منظور کی لی گئی۔

فوجداری فیصلے

اشتہاری ملزم کے انتخابات کے لئے اہل ہونے یا نہ ہونے کے حوالے سے سپریم کورٹ کا اہم فیصلہ [41]

محمد ذیشان حیات خان خٹک [42]

کیس کے حقائق:

عمر اسلم خان (پٹیشنر) نامی شخص جو کہ قومی اسمبلی این اے-۸۷ خوشاب کا امیدوار بننے کے لیے خواہشمند ہوتا ہے جو اپنے کاغذات نامزدگی ریٹرننگ افسر کے سامنے جمع کرتا ہے مگر ریٹرننگ افسر اس بنیاد پر اس کے کاغذات نامزدگی ۳۰ دسمبر ۲۰۲۳ کو مسترد کر دیتا ہے کہ درخواست گزار اشتہاری ملزم ہے۔ اس کے بعد موجود پٹیشنر ریٹرننگ افسر کے اس فیصلے کے خلاف اپیلیٹ ٹرائبونل میں اپیل جمع کرتا ہے جو کہ منظور ہو جاتی ہے۔

اپیلیٹ ٹرائبونل کے فیصلے کے خلاف الیکشن کمیشن آف پاکستان لاہور ہائی کورٹ، لاہور میں رٹ پٹیشن زیر آرٹیکل ۱۹۹ جمع کرتی جو کہ ۱۲ جنوری ۲۰۲۴ منظور ہو جاتی ہے اور لاہور ہائی کورٹ موجود پٹیشنر کے کاغذات نامزدگی کو مسترد تصور سمجھے جانے کے احکامات صادر فرما دیتی ہے۔ پٹیشنر لاہور ہائی کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف آئین پاکستان کے آرٹیکل ۱۸۵ [۳] کے زیر سپریم کورٹ آف پاکستان کے اپیلیٹ دائرہ اختیار میں سول پٹیشن دائر کر دیتا ہے۔

عدالت کے سامنے بنیادی سوال:

- آیا اشتہاری ملزم الیکشن لڑنے کا حقدار ہے یا نہیں؟ اور اس نقطے کے بارے میں آئین و قانون کیا کہتا ہے؟

اب دونوں فریقین کے وکلاء صاحبان کے دلائل کے دوران عدالت حضور کے علم میں یہ بات بھی آتی ہے کہ لاہور ہائی کورٹ، لاہور کے اسی بینچ نے [رٹ پٹیشن نمبر: ۲۳۸۳ آف ۲۰۲۴] میں اشتہاری ہونے کے گراؤنڈ پر یہ نقطہ طے کیا کہ محض اشتہاری ہونے کے بنیاد پر الیکشن لڑنے سے کسی کو محروم نہیں کیا جا سکتا جو کہ بالکل اسی موجودہ

---

[41] اس کیس کے مصنف جج جسٹس منصور علی شاہ ہے، ان کے ساتھ بینچ میں جسٹس جمال مندوخیل اور جسٹس اطہر من اللہ شامل ہے۔ اس کیس کو سول پیٹیشن نمبر ۱۵۹ آف ۲۰۲۴ کے تحت تلاش کیا جا سکتا ہے۔

[42] ایڈووکیٹ، ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن نوشہرہ و ممبر ٹیم آئین و قانون۔

کیس کی نوعیت کا کیس تھا مگر لاہور ہائی کورٹ، لاہور کے ایک ہی بینچ نے ایک ہی نوعیت کے کیس میں متضاد فیصلے صادر کیے، جو کہ انتہائی تعجب کی بات تھی۔

اس کے بعد عدالت الیکشن کمیشن کے وکیل صاحب سے استفسار کرتی ہے کہ ہمیں الیکشن ایکٹ، ۲۰۱۷ اور آئین پاکستان، ۱۹۷۳ کوئی ایسی شق بتادیں جو اس بات کو یقینی بناتی ہو کہ اشتہاری ملزم الیکشن لڑنے کا حقدار نہیں، لیکن الیکشن کمیشن کا وکیل ایسا کچھ الیکشن ایکٹ، ۲۰۱۷ اور نہ آئین پاکستان میں کچھ دکھا پاتا ہے عدالت کو۔

جس کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ موجود پٹیشنر جو کہ کیس ایف آئی آر نمبر ۲۳۱ سال ۲۰۲۳ میں اشتہاری تھا، اج عبوری ضمانت کے ساتھ اس عدالت کے سامنے پیش ہے جو کہ مزید اشتہاری نہیں رہا اس کے بعد عدالت آئین پاکستان کے آرٹیکل ۶۲ کے شق [۱] کے ذیلی شق [ڈی]، [ای]، [ایف] اور [جی] کا ذکر کرتی ہے اور اس نتیجے پر پہنچ جاتی کہ ان شقوں میں بھی اشتہاری ملزم کو الیکشن لڑنے سے روکنے کا ذکر نہیں کیا گیا اور نہ ہی الیکشن ایکٹ، ۲۰۱۷ میں کوئی ایسی شق موجود ہے جو اشتہاری ملزم کو الیکشن لڑنے سے روکے نہ ہی آئین پاکستان میں کوایسی شق موجود ہے۔ لہذا عدالت پٹیشنر کی درخواست منظور کر کے لاہور ہائی کورٹ لاہور کے فیصلے کو کالعدم قرار دیتی ہے اور الیکشن کمیشن کو یہ حکم دیتی ہے کہ پٹیشنر کے کاغذات کو فوراً منظور کیا جائے۔

خلاصہ:

عدالت حضور نے اس کیس میں یہ بات بتائی ہے کہ نہ تو الیکشن ایکٹ ۲۰۱۷ میں کوئی ایسی شق موجود ہے جو اشتہاری ملزم کو الیکشن لڑنے سے روکے نہ ہی آئین پاکستان میں کوایسی شق موجود ہے جو اشتہاری ملزم کو الیکشن لڑنے سے روکے، لہذا محض اشتہاری ہونے کے بناء پر کسی کو الیکشن لڑنے سے روکا نہیں جاسکتا۔

دفعہ ۵۶۱- اے[مجموعہ ضابطہ فوجداری]اور آئین کے آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت ہائی کورٹ کے فوجداری اختیارات کے حوالے سے سپریم کورٹ کا فیصلہ[43]

مدثر اقبال[44]

پس منظر:

یہ کیس عدالت عظمیٰ میں بطور" لیو ٹو اپیل[45] "پیش ہوا ، جس میں مدعیان [ایف آئی اے] نے اسلام آباد ہائی کورٹ کے فیصلہ کو ختم کرنے درخواست کی تھی۔

ہائی کورٹ نے مدعی علیھان[ملزمان] کی آئینی درخواست [رٹ پٹیشن] اور دو فوجداری درخواستیں[زیر دفعہ ۵۶۱-اے] کو قبول کرتے ہوئے ان کے خلاف درج ایف آئی آر کو ختم کرنے کا حکم جاری کیا۔ جس کے خلاف ایف آئی اے نے سپریم کورٹ میں یہ کیس دائر کیا۔

کیس کے حقائق:

کیس کی ابتدا اخبار میں ایک خبر شائع ہونے سے ہوئی جس میں یہ بیان تھا کہ سی ڈی اے کے کئی اہلکاروں کو غیر قانونی طور پر ترقی دی گئی تھی ۔ اس پر ایف آئی اے نے انکوائری کی اور ملزمان کے خلاف ایف آئی آر درج کی ۔ ملزمان نے ہائی کورٹ میں رٹ پٹیشن اور ۲ درخواستیں جمع کی ، جس پر ہائی کورٹ نے ایف آئی آر ختم کردی۔اس فیصلے کے خلاف مدعی[ایف آئی اے]نے سپریم کورٹ میں" لیو ٹو اپیل "دائر کی۔

سب سے پہلے عدالت نے کہا کہ ہائی کورٹ کے پاس زیر دفعہ ۵۶۱-اے مجموعہ ضابطہ فوجداری کے تحت ایف آئی آر یا تفتیش کو ختم کرنے کا اختیار نہیں ہے، لہذا یہ زیر دفعہ ۵۶۱-اے کے تحت درخواستیں قابل سماعت نہیں ہے۔

---

[43] یہ کیس دو رکنی بنچ کا ہے اور اس کے مصنف جسٹس منصور علی شاہ ہے اور اس کو [پی،ایل،ڈی۲۰۲۳ سپریم کورٹ صفحہ ۲۶۵] کے طور پر تلاش کیا جاسکتا ہے۔

[44] طالب علم شعبہ قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد و ممبر ٹیم آئین و قانون اوران کو mudassiribal880@gmail.com کے زریعے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

[45] Leave to appeal.

عدالت نے کہا کہ اس دفعہ میں ہائی کورٹ کے پاس اختیار صرف اور صرف عدالتی کارروائی میں مداخلت تک ہے نہ کہ کسی دوسرے ادارے [پولیس] کے معاملات تک۔ عدالت نےاس کے لیے مشور کیس شہناز بیگم[46] کا حوالہ دیا۔

مزید عدالت نے اس بات پر توجہ دی کہ چلان جمع کرنے سے پہلے اگر ملزم کو یہ خدشہ ہو کہ ایف آئی آر غلط ہے یا تفتیشی کاروائی غیر قانونی ہے تو اس کے خلاف آئین کے آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت ہائی کورٹ کو رجوع کرسکتا ہے۔

عدالت نے یہ کہا کو اس کیس میں ہائی کورٹ کے دفعہ ۵۶۱- اے کے تحت یہ اختیارات حاصل نہیں ہے تاہم یہ اختیارات آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت استعمال ہوسکتے ہیں اس لیے اس کیس پر اس کوئی اثر نہیں ہے کیونکہ یہ کام ساتھ میں ۱۹۹ کے تحت بھی عدالت نے سنا ہے۔

عدالت نے کہا کہ اس کیس میں جو دفعات لگائے گئے ہیں اس سے کوئی جرم نہیں بنتا اور یہ جو کاروائی ہائی کورٹ نے کی ہے یہ آرٹیکل ۱۹۹[۱][اے][۲]کے دائرہ کارمیں آتی ہے۔اس کے بعد عدالت آرٹیکل ۱۹۹[۱][اے][۲] کی تشریح کی طرف آتی ہے کہ اس کے تحت ہائی کورٹ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وفاق کے تحت کاموں ، صوبے کے معاملات اور لوکل اتھارٹی کے کاموں کی قانونیت کو جانچ سکتی ہے اور ایف آئی آر جو کہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ دائر کی جاتی ہے اور یہ ایک صوبائی محکمہ ہےلہذا اس آرٹیکل کے تحت ہائی کورٹ کو اختیار سماعت حاصل ہے اور اس کے تحت ہائی کورٹ ایف آئی آر یا تفتیش کو ختم کرسکتی ہے۔

اس کے بعد عدالت نے ایف آئی اے، ایکٹ کے مختلف شقوں کا حوالہ اور ساتھ میں مجموعہ ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۱۵۵،۱۵۴کے تحت ایف آئی آر کی رجسٹریشن اور تفتیش کے معاملات پر بحث کی۔

عدالت نے ایف آئی آر میں لگائے گئے دفعات کے تحت ایف آئی اے حکام سے سوالات کیے کہ کیا یہ جرائم انہوں نے کیے ہے یا انہوں کو کام کہا ان سے یہ جرائم بنتے ہیں یا نہیں ۔ اس پر عدالت نے کہا کہ ان جرائم کی جو اجزاء ترکیبی ہے وہ اس کیس میں مکمل نہیں ہے لہذا ایف

[46] پی ایل ڈی ۱۹۷۱ سپریم کورٹ صفحہ ۶۷۷۔

آئی اے حکام کے تمام کاروائی غیر قانونی ہے ۔ جس پر عدالت نے ہائی کورٹ کے اس فیصلے کو برقرار رکھا اور ساتھ میں غیر معمولی کیسوں کو عدالت میں لانے اور بلاوجہ شہریوں کو ہراساں کرنے پر ایف آئی اے کے زمہ داراں کو ایک لاکھ روپے بطور جرمانہ ادا کرنے کا حکم صادر کیا۔

منشیات کے کیسز میں ویڈیو گرافی کے حوالے سے سپریم کورٹ کا ایک انتہائی اہم فیصلہ[47]

محمد ذوالقرنین[48]

کیس کے حقائق:

۲۹مئی ۲۰۲۳ کو تھانہ سیکرٹریٹ اسلام آباد نے زاہد سرفراز گل نامی ملزم کو انسداد منشیات ایکٹ کے دفعہ۹{سی} کے تحت۱۸۳۳ گرام چرس رکھنے کے جرم میں گرفتار کیا جس کے لئے قانون میں کم سے کم سزا۹ سال جبکہ زیادہ سے زیادہ ۱۴ سال قید و جرمانہ ہے۔ ایف آئی آر کے اندراج کے بعد نچلی تمام عدالتوں سے درخواست ضمانت خارج ہونے کے بعد یہ کیس سپریم کورٹ پہنچا اور سپریم کورٹ میں یہ کیس تین رکنی بینچ جن میں چیف جسٹس قاضی فائز عیسیٰ صاحب ، جسٹس امین الدین خان اور جسٹس اطہر من اللہ صاحب شامل تھے کے سامنے مقرر ہوا۔

وکلاء کے دلائل:

ملزم کے وکیل کی جانب سے عدالت میں پہلا نکتہ یہ اٹھایا گیا کہ ایک بے بنیاد اور غلط کیس ہے اور ملزم کو اس کیس میں صرف اس وجہ سے نامزد کیا گیا ہے کہ ملزم نے پولیس کے کچھ حکام کے خلاف۷امئی کو ایک درخواست دی تھی جس کے جواب میں ملزم کو اس ایف آئی آر میں

---

[47] یہ فیصلہ چیف جسٹس قاضی فائز عیسیٰ صاحب نے لکھا ہے اور ان کے ساتھ جسٹس امین الدین خان اور جسٹس اطہر من اللہ صاحب نے اتفاق کیا ہے اور یہ فیصلہ کریمنل پیٹیشن نمبر ۱۱۹۲ پر پڑھا جا سکتا ہے۔

[48] ایڈووکیٹ وشریک بانی آئین و قانون۔

نامزد کیا گیا اور اس کے علاوہ یہ اہم نکتہ بھی اٹھایا گیا کہ جائے وقوعہ پر بوقت وقوعہ ملزم کی موجودگی بھی نہیں ہے۔

ریاست کی جانب سے سٹیٹ کونسل نے سپریم کورٹ میں یہ دلائل دئے کہ ملزم کو رنگے ہاتھوں دن دیہاڑے ۶ بجے ایک عوامی پارک سے گرفتار کیا گیا ہے تو اس لئے ملزم کے خلاف کیس ثابت ہوتا ہے جس کے جواب میں ملزم کے وکیل نے یہ نکتہ اٹھایا کہ چھ بجے ایک عوامی پارک میں ملزم کو گرفتار کیا گیا لیکن اس کے باوجود وقوعہ کے عینی شاہدین صرف پولیس والے ہیں اور اس کے علاوہ نہ تو کوئی فوٹو گرافی اور نہ ہی کوئی ویڈیو گرافی کی گئ اور یہی بات پولیس کے کردار کو مشکوک بناتی ہے۔

سپریم کورٹ نے فریقین کے وکلاء کے دلائل سننے کے بعد پہلے ہی فرصت میں اس کیس کو مزید انکوائری کا کیس قرار دے ملزم کی درخواست ضمانت کو منظور کرتے ہوئے ملزم کو ایک لاکھ روپے کے ضمانتی مچلکے جمع کرانے کا حکم دیا۔ عدالت نے یہ فیصلہ سنانے کے بعد ایک نہایت ہی خوبصورت بحث کا آغاز کیا ہے ۔

عدالتی بحث:

جسٹس قاضی فائز عیسیٰ صاحب نے بحث کا آغاز اس نکتے سے کیا ہے کہ انسداد منشیات ایکٹ کے دفعہ ۲۵ کی تنفیذ کے بعد منشیات کے کیسز میں ضابطہ فوجداری کے دفعہ ایک۱۰۳ کا اثر ختم ہوگیا ہے جس کے تحت پولیس پر یہ لازمی تھا کہ پولیس اپنے ساتھ تلاشی کے وقت۲ پرائویٹ گواہ رکھنے کی پابند تھی۔ یہاں پر عدالت نے اس امر پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ آخر کیوں پولیس اور انسداد منشیات فورس تلاشی کے وقت فوٹو گرافی کیوں نہیں کرتی حالانکہ قانون شہادت آرڈر کا آرٹیکل ایک۱۶۴ اس حوالے سے بڑا واضح ہے۔ عدالت نے یہاں پر اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ انسداد منشیات کے کیسز میں عمومی طور پر استغاثہ کے گواہان سرکاری ہوتے ہیں جن کے پاس موبائل فون موجود ہی ہوتے ہیں تو وہ آخر کیوں فوٹو گرافی و ویڈیو گرافی نہیں کرتے کیونکہ اس سے نہ صرف جائے وقوعہ پر ملزم کی موجودگی جانچنے میں آسانی ہوگی بلکہ اس سے انسداد منشیات فورس کے خلاف قائم اس تصور کا خاتمہ بھی ہوسکے گا کہ وہ غلط کیسز بناتے ہیں۔ عدالت نے اس کے بعد اس بات کا بھی زکر کیا ہے کہ منشیات فروش اپنے خریداروں کو

عادی بنا کر نہ صرف ان کو تباہ کرتی ہے بلکہ ان کے خاندان کو بھی تباہی کے دہانے پر پہنچا دیتے ہیں اور چونکہ انسداد منشیات فورس کو تنخواہیں سرکاری فنڈ سے جاتی ہیں تو اس لئے ان پر لازمی ہے کہ وہ اس مکروہ دھندے کی روک تھام بہر صورت کرے۔ عدالت نے آخر میں تمام قانون نافذ کرنے والے اداروں پر زور دیتے ہوئے کہا ہے کہ وقت آگیا ہے کہ ہم سب حقیقی شہادت یعنی ثبوت کے حصول کے لئے ہر ممکن راہ اپنائیں۔

عدالت نے فیصلے کے آخر میں یہ فیصلہ تمام متعلقہ اداروں کو بھیجنے کا حکم دیتے ہوئے لکھا ہے کہ پولیس اور انسداد منشیات فورس اپنے متعلقہ قوانین میں ویڈیو گرافی اور فوٹو گرافی کے حوالے سے مناسب ترامیم پر بھی غور کر سکتی ہے۔

خلاصہ:

کہ انسداد منشیات کے کیسز میں پولیس و انسداد منشیات فورس ملزمان کے خلاف حقیقی ثبوت و شواہد کے لئے ویڈیو گرافی و فوٹو گرافی کرے کیونکہ اس سے نہ صرف غلط کیسز کا خاتمہ ہوگا بلکہ حقیقی مجرمان اپنے پایہ تکمیل تک بھی پہنچ پائیں گے۔

ایوان فیلڈ ریفرنس میں مریم نواز اور کیپٹن صفدر کی اپیلوں پر اور ان کو بری کرنے پر اسلام آباد ہائی کورٹ کا فیصلہ[49]

قاسم اقبال جلالی[50]

کیس کے حقائق:

[49] اس فیصلے کے مصنف جج جسٹس عامر فاروق ہے اور اس کیس کو کریمینل اپیل نمبر ۱۲۲ آف ۲۰۱۸ یا "مریم نواز شریف [مریم صفدر] بنام ریاست" کے تحت تلاش کیا جاسکتا ہے۔

[50] ایڈووکیٹ ہائی کورٹ، اور ان کو jalali3388@gmail.com کے زریعے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

نیب کا الزام یہ تھا کہ نوازشریف نے پبلک آفس ہولڈر ہوتے ہوئے، کرپشن کی، اور کرپشن کے پیسے سے لندن میں ایوان فیلڈ کے ۴ اپارٹمنٹس خریدے، جو اُن کے معلوم ذرائع آمدن سے مطابقت نہیں رکھتے۔ یہ اپارٹمنٹ ۲ آف شور کمپنیوں نیلسن اور نیسکول کے ذریعے خریدے گئے۔ نیب کے مطابق یہ اپارٹمنٹ ۱۹۹۳ سے ۱۹۹۶ کے درمیان کسی وقت خریدے گئے۔ نیب کا الزام تھا کہ مذکورہ اپارٹمنٹس کا اصل مالک شروع سے ہی نوازشریف ہے، اور یہ بات عوامی علم میں عرصہ دراز سے ہے، لیکن ملزمان نے مجرمانہ ملی بھگت سے، نوازشریف کو بچانے کیلئے، ایک جعلی ٹرسٹ ڈیڈ تیار کی۔ نوازشریف کے بجائے حسین نواز کو بینیفیشل اونر [اصل مالک] سمجھ لے ظاہر کرنے والی ۲۰۰۶ کی ٹرسٹ ڈیڈ جعلی ہے، جس میں کیلیبری فونٹ استعمال ہُوا، جبکہ نیب کے مطابق یہ ٹرسٹ ڈیڈ ۲۰۰۶ کے بہت بعد کسی وقت بنائی گئی کیونکہ ۲۰۰۶ میں کیلبری فونٹ دستیاب نہیں تھا۔نیب کے مطابق مریم نواز نے جعلی ٹرسٹ ڈیڈ تیار کی اور کیپٹن صفدر اس جعل سازی میں معاونت کی اور گواہ بنا، لہذا یہ کرپشن اور کرپٹ پریکٹس کی دیدہ دانستہ معاونت کرنے کے ملزم ہیں۔

نیب نے الزامات کو ثابت کرنے کیلئے ۱۸ گواہ نیب عدالت میں پیش کیے جبکہ درجنوں دستاویزات بطور شہادت پیش کی گئیں۔ نیب کے اہم ترین گواہ ۲ تھے۔ ایک واجد ضیاء جو جائینٹ تفتیشی ٹیم کے سربراہ تھے جبکہ دوسرا رابرٹ ریڈلے جسے فونٹس کے ماہر [ایکسپرٹ] کے طور پہ پیش کیا گیا۔نیب نے کیس میں انہی دو گواہان پہ زیادہ انحصار کیا۔

نیب نے نوازشریف اور اس کے بیٹوں کے پارلیمنٹ میں اور میڈیا پہ بیانات کی ویڈیوز بھی شہادت میں پیش کی جن میں نیب کے مطابق ملزمان مذکورہ اپارٹمنٹس کی ملکیت تسلیم کر رہے ہیں۔ نیب کی شہادت کا ایک اہم حصہ پاناما کیس میں دی گئی سپریم کورٹ کی ججمنٹ بھی تھی۔

ملزمان نے مذکورہ اپارٹمنٹس کی ملکیت کے بارے میں عدالت میں جو وضاحت پیش کی وہ کچھ یوں تھی:

میاں شریف نے ۱۹۷۴ میں یو۔اے۔ای[دبئی] میں سٹیل مل لگائی جس میں قطر کی الثانی فیملی پارٹنر تھی۔ یہی الثانی فیملی نیلسن اور نیسکول کی مالک تھی جس نے مذکورہ اپارٹمنٹس خرید رکھے

تھے۔ مذکورہ سٹیل مل کے قرضہ جات کو چکتا کرنے کیلئے شراکت داروں میں معاہدہ ہوا جس کے مطابق قطر کی الثانی فیملی نے مذکورہ دونوں کمپنیوں یعنی نیلسن اور نیسکول کے شئیرز حسین نواز کو ٹرانسفر کرنے تھے۔ اِس ٹرانسفر کیلئے حسین نواز نے مریم نواز کو اپنا مختارِ خاص مقرر کیا اور کچھ عرصہ کیلئے مریم نواز کو ۲۰۰۶ میں مذکورہ پراپرٹیز کا ٹرسٹی بنا دیا۔ بعد ازاں پانچ ماہ کے اندر ہی ملکیت حسین نواز کو ٹرانسفر ہوگئی اور شیئرز منسوخ ہو گئے اور نئے شئیرز، کمپنیوں کے نئے ڈائریکٹرز کے نام جاری ہو گئے، ٹرسٹ ڈیڈ ختم ہو گئی اور مریم نواز کا عمل دخل ختم ہو گیا۔ اس ضمن میں ملزمان نے نئی [مینویرا کمپنیز] کے نام جاری شدہ نئے شئیرز کا ریکارڈ بھی پیش کیا جو سپریم کورٹ میں بھی [سی ایم اے نمبر ۵۳۱۷ آف ۲۰۱۶] کے ذریعے جمع کروایا گیا تھا۔

اسلام آباد ہائی کورٹ نے اپیل میں کل ۱۶ سماعتیں کیں اور ملزمان کے وکلاء اور نیب کو تفصیل سے سُنا۔ ملزمان کے وکلاء کو بہت زیادہ وقت دیا گیا جبکہ نیب کو نسبتاً کم وقت ملا۔

اسلام آباد ہائی کورٹ نے نیب کی شہادت، پیش کردہ دستاویزات کا تفصیلی جائزہ لیا اور اس حوالے سے قانون اور اعلیٰ عدلیہ کے فیصلوں کو بھی متعدد جگہ تحریر کیا جسکا خلاصہ کچھ یوں ہے:

1. نیب نے یہ ثابت کرنا تھا کہ نوازشریف کا معلوم ذرائع آمدن کیا کیا تھا اور پھر ثابت کرنا تھا کہ ایوان فیلڈ اپارٹمنٹس کی قیمت کیا تھی۔ پھر نیب نے دستاویزات سے ثابت کرنا تھا کہ ایوان فیلڈ اپارٹمنٹس کی قیمت نوازشریف [یا ملزمان] کے معلوم ذرائع سے بمطابق نہیں رکھتی۔نیب نے نہ تو نوازشریف کے" معلوم ذرائع آمدن "بتائے، نہ ہی پورے ٹرائل کے دوران یا جے آئی ٹی رپورٹ میں لندن اپارٹمنٹس کی قیمت کا تعین کیا گیا۔لہذا ملزمان کے وکلاء نے کہا کہ نیب اپنا بارِ ثبوت ہی مکمل نہیں کر پائی، لہذا ملزمان پہ بارِ ثبوت تبدیل ہی نہیں ہُوا۔ اِس دلیل کو عدالت نے درست

تسلیم کیا اور اِس حوالے سے اعلیٰ عدلیہ کے متعدد فیصلوں[51] کے حوالہ جات بھی موجود ہے۔

2. نیب نے ثابت کرنا تھا کہ مذکورہ اپارٹمنٹس کرپشن کی رقم سے خریدے گئے۔ لیکن نیب پورے ٹرائل میں کرپشن کا کوئی کیس ثابت نہ کر سکی۔ نہ ہی کرپشن کے حوالے سے کسی واقعے، گواہ یا دستاویز کو پیش کر سکی۔[اسی لیے نوازشریف کو اِس کیس میں کرپشن کے الزام سے بری کر دیا گیا تھا]۔اسلام آباد ہائی کورٹ نے حیرت کا اظہار کیا کہ نیب نے کرپشن کا الزام تو لگایا لیکن کرپشن کے الزام سے بریت کے خلاف کوئی اپیل ہی فائل نہیں کی گئی ۔[حالانکہ جب فیصلہ آیا تو عمران خان صاحب کی حکومت تھی]۔نیب نے یہ ثابت کرنا تھا کہ مذکورہ اپارٹمنٹس ۹۴/۱۹۹۳ میں جن کمپنیوں نے خریدے وہ نوازشریف نے یا اس کے بچوں نے بنائیے،نیز یہ ثابت کرنا تھا کہ مذکورہ اپارٹمنٹس کا اصل مالک نوازشریف ہے۔نیب ٹرائل کے دوران کوئی ایسی مصدقہ دستاویزات پیش نہ کر سکی جس سے ثابت ہوسکے نیلسن اور نیسکول آف شور کمپنیاں نوازشریف نے بنائی۔ نہ ہی کوئی ایسی دستاویزی شہادت ریکارڈ پہ لائی جا سکی جو نوازشریف کو مذکورہ اپارٹمنٹس کا بینیفیشل اونر ثابت کرسکے۔نیب نے پانامہ پیپرز لیک کرنے والی لاء فرم کا ایک خط عدالت میں پیش کیا، جس میں مذکورہ فرم نے کہا کہ" دستاویزات "کے مطابق مذکورہ کمپنیوں کے بینیفیشل آونر نوازشریف، مریم نواز، اور دیگر بچے ہیں۔ عدالت نے قرار دیا کہ مذکورہ خط میں جن دستاویزات پہ انحصار کرکے نوازشریف کو اصل مالک قرار دیا گیا ہے، نہ تو وہ دستاویزات عدالت میں پیش کی گئیں، نہ ہی مذکورہ خط میں اُنکا کوئی ذکر ہے۔ لہذا صرف موزیک فونیکا

---

[51] ۲۰۱۱ایس سی ایم آر صفحہ ۱۳۷، ۲۰۰۲وائی ایل آر صفحہ ۱۴۰۰، ۲۰۰۹ایس سی ایم آر ۷۹۰ صفحہ، پی ایل ڈی ۲۰۰۲ پشاور ۱۱۸ صفحہ، ۲۰۱۸ پی سی آر ایل جے ۱۶۸۲ صفحہ، ۲۰۰۷ پی سی آر ایل جے صفحہ ۷۹۲، ۲۰۲۲ پی سی آر ایل جے صفحہ ۱۳۷، پی ایل ڈی ۲۰۰۴ لاہور صفحہ ۱۵۵۔

کے مذکورہ کورنگ لیٹر کی بنیاد پہ یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ کون اپارٹمنٹس کا مالک ہے۔

3. نیب نے یہ ثابت کرنا تھا کہ نوازشریف کسی بھی وقت میں مذکورہ اپارٹمنٹس کا مالک یا بینیفیشل اونر رہا ہے۔ عدالت کے مطابق نیب نے پوری کارروائی کے دوران کوئی ایک بھی ایسی دستاویز پیش نہیں کی جس پہ نوازشریف کا نام مذکورہ پراپرٹی کے حوالے سے موجود ہو۔ حتیٰ کہ، ہائی کورٹ کے مطابق، اپیل کی سماعت کے دوران بھی نیب کو متعدد سماعتوں پہ کہا گیا کہ کوئی ایک ایسی دستاویز پیش کر دی جائے جس سے نوازشریف کا کوئی لنک مذکورہ اپارٹمنٹس سے ملتا ہو، لیکن ایسی کوئی شہادت پیش نہ کی گئی۔

4. نیب کے وکلاء کی ایک اہم دلیل یہ تھی کہ یہ بات، میڈیا اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے، عام پبلک کے علم میں ہے کہ مذکورہ فلیٹس عرصہ دراز سے نوازشریف کے پاس ہیں لہذا اس کو جوڈیشل نوٹس کا لینا عدالت پہ لازم ہے۔ اور جو بات عوام الناس کے علم میں ہو، اُسے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

5. عدالت نے فیصلے میں اس دلیل کو یہ کہتے ہوئے رد کیا کہ قانونِ شہادت اور عدالتی نظائر[52] کے مطابق عدالت عوام الناس کے علم میں موجود صرف انہی باتوں کا جوڈیشل نوٹس لے سکتی ہے جو غیر متنازعہ اور بلاشقوق وشبہات ہوں۔ جہاں ایک فریق اُس بات کو قبول نہ کرتا ہو، وہاں مدعی پہ بارِ ثبوت شفٹ ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ کریمینل کیسز خصوصاً نیب کیسز میں پبلک نالج کی بنیاد پہ بارِ ثبوت ملزم پہ شفٹ نہیں کیا جاسکتا بلکہ نیب کو اپنی ابتدائی ذمہ داری پوری کرنی ہوتی ہے جو اِس کیس میں نہیں کی گئی۔

6. نیب کی ایک دلیل یہ بھی تھی کہ ملزمان نے ذرائع ابلاغ میں متعدد مرتبہ مذکورہ اپارٹمنٹس کی ملکیت تسلیم کی ہے لہذا اِن اقبالی بیانات کے ہوتے ہوئے نیب کو

---

[52] ۲۰۱۸ وائی ایل آر صفحہ ۵۵۰۔

ملکیت ثابت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔عدالت نے یہ دلیل بھی رد کر دی اور فیصلے میں لکھا کہ عدالت کے باہر کیے گئے اقبال کی کوئی اہمیت نہیں اور اعلی عدلیہ ماضی کے کثیر فیصلوں[53] میں یہ قرار دے چکی ہے کہ ایسے اقبالی بیان کے باوجود پراسیکیوشن کی ذمہ داری ہے کہ وہ جرم کو ثابت کرنے کیلئے شہادت پیش کرے۔سپریم کورٹ نے قرار دیا ہے کہ جہاں پراسیکیوشن اپنا کیس ثابت کرنے میں ناکام ہو جائے وہاں اقبالی بیان کے باوجود ملزم کو بری کیا جائے گا۔

7. عدالت نے فیصلے میں لکھا ہے کہ پاناما میں قائم غیر ملکی لاء فرم کے خط کو، جس میں نوازشریف و مریم نواز کو بینیفیشل اونر کہا گیا ہے، بطور ثبوت پیش کرنا اور اس پہ انحصار کرنا قانون کے خلاف ہے کیونکہ قانون میں" غیر ملکی حکومت "سے حاصل شدہ مصدقہ دستاویزات پہ انحصار کرنے کا زکر ہے کسی پرائیویٹ لاء فرم سے موصول شدہ دستاویز کو یہ قانونی حیثیت حاصل نہیں۔ لہذا فقط ایسے پرائیویٹ خط کی بنیاد پہ کسی کو سزا نہیں دی جاسکتی۔عدالت نے مزید لکھا کہ اگر اِس خط قبول کر بھی لیا جائے تو اِس کیساتھ مریم نواز کے نوازشریف پر منحصر ہونے یا اپارٹمنٹس کے بینیفیشل اونر ہونے کا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں لگایا گیا، لہذا اس خط پہ انحصار نہیں کیا جاسکتا۔

8. نیب کا اہم ترین گواہ رابرٹ ریڈلے تھا۔ جس نے نیب کے مطابق یہ ثابت کرنا تھا کہ جب ٹرسٹ ڈیڈ بنی تب کیلبری فونٹ وجود نہیں رکھتا تھا۔تاہم دوران جرح مذکورہ گواہ نے تسلیم کر لیا کہ وہ نہ تو آئی ٹی کا ایکسپرٹ ہے اور نہ ہی فونٹس کا ماہر ہے۔نیب یا گواہ دونوں نے رابرٹ ریڈلے کی ماہریت کا کوئی دستاویزی ثبوت یعنی تعلیمی قابلیت یا سپیشل کورس /تجربے کے ثبوت پیش نہیں کیا۔ لہذا یہ گواہ قانون شہادت کے آرٹیکل ۵۹ میں موجود ایکسپرٹ کی تعریف میں نہیں آتا۔دوران جرح گواہ نے تسلیم کیا کہ کیلبری فونٹ ۲۰۰۶ سے قبل بھی موجود تھا اور اُس نے خود

---

[53] ۲۰۱۷وائی ایل آر صفحہ ۴۳۶، ۲۰۲۲پی سی آر ایل جے صفحہ ۵۹۱، ۲۰۱۵ایم ایل ڈی صفحہ ۱۵۳۱، ۲۰۱۳ایس سی ایم آر صفحہ ۳۸۳۳۔

بھی اسے ۲۰۰۶ سے قبل استعمال کیا تھا۔ گواہ نے جرح میں تسلیم کیا کہ ونڈو[ویژٹا] سال ۲۰۰۷ میں لانچ ہوئی لیکن اسکا بیٹاورژن سال ۲۰۰۵ میں بھی موجود تھا۔ گواہ نے تسلیم کیا کہ مائیکرو سافٹ کے تمام پروگراموں میں کیلبری فونٹ استعمال کیا جاتا ہے [یعنی ونڈو ویڈٹا کے بیٹاورژن میں بھی کیلبری فونٹ موجود تھا] گواہ نے مزید تسلیم کیا کہ ۲۰۰۵ میں مائیکرو سافٹ نے ۶ نئے فونٹ متعارف کروائے تھے جن میں کیلبری فونٹ بھی شامل تھا۔ملزمان کے وکلاء نے رابرٹ ریڈلے کی معتبریت[کریڈیبیلٹی] پہ بھی سوالات اٹھائے اور ثابت کیا کہ مذکورہ گواہ جس لاء فرم سے وابستہ رہا ہے، اسکا ایک پارٹنر واجد ضیاء کا قریبی رشتہ دار ہے۔ لہذا عدالت نے مذکورہ گواہ کی گواہی کو کمزور قرار دیتے ہوئے رد کر دیا۔

مذکورہ بالا نتائج کی بنیاد پہ عدالت نے ملزمان مریم نواز اور کیپٹن صفدر کو بری کر دیا۔

وکلاء سمیت مختلف پیشوں کے لبادے میں ہونے والے جرائم یعنی زاتی گاڑیوں مختلف نمبر پلیٹ لگا کر جرم کرنے کے حوالے سے پشاور ہائی کورٹ کا ایک اہم فیصلہ[54]

محمد ذوالقرنین[55]

کیس کے حقائق :

۵نومبر۲۰۲۳ کو مردان کی مقامی پولیس کو خفیہ اطلاع ملی کہ ایک ویگو گاڑی میں جس کے نمبر پلیٹ پر " ممبر پشاور ہائی کورٹ بار کونسل " لکھا ہوا ہے میں ضلع ملاکنڈ سے ضلع صوابی منشیات کو سمگل کیا جارہا ہے جس کے نتیجے میں پولیس نے ناکہ بندی کی اور مختصرا یہ کہ مذکورہ گاڑی ناکہ بندی پر پولیس کے شکنجے میں آجاتی ہے اور گاڑی سے بھاری مقدار میں آئس برآمد ہو جاتی

[54] یہ اہم فیصلہ پشاور ہائی کورٹ کے سینئر جج ؛ جسٹس اشتیاق ابرہیم صاحب نے لکھا ہے جس کو[کریمینل ۔ایم بیل اپیل نمبر ۴۰۵۰-پی آف] کے طور پر پڑھا اور دیکھا جا سکتا ہے۔

[55] ایڈوکیٹ، پشاور بار ایسوسی ایشن و شریک بانی ٹیم آئین و قانون۔

ہے اور یوں گاڑی میں موجود دو ملزمان بھی گرفتار ہو جاتے ہیں جن پر پولیس کی جانب سے انسداد منشیات ایکٹ کے دفعہ ۱۱[سی] کے تحت ایف آئی آر کا اندراج کر دیا جاتا ہے۔ ملزمان کی گرفتاری اور ایف آئی آر کے بعد ملزمان کی جانب سے ضمانت کی درخواست نہ صرف سیشن کورٹ سے خارج ہوتی ہے بلکہ ہائی کورٹ بھی ملزم کی ضمانت کی درخواست کو خارج کر دیتی ہے۔

یہاں تک تو یہ کیس منشیات کے باقی کیسز کی طرح بالکل ایک عام کیس تھا لیکن اس کے بعد عدالت نے ملزمان کی جانب سے نمبر پلیٹ پر لکھے جانے الفاظ یعنی ممبر پشاور ہائی کورٹ بار کونسل کا رخ کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ گرفتار ہونے والے دونوں ملزمان کا تعلق نہ تو کسی بار ایسوسی ایشن سے ہے اور نہ ہی وہ بار کونسل کے ممبر ہیں بلکہ ملزمان صرف شعبہ وکالت کے لبادے میں سمگلنگ کر رہے تھے۔ عدالت نے یہاں پر اس امر کا اظہار بھی کیا کہ ہم بسا اوقات اس تلخ حقیقت کو بیان کر چکے ہیں کہ اکثر اوقات ملزمان مختلف محکموں بشمول وکالت کا لبادہ استعمال کر کے اپنے آپ کو قانون کی گرفت اور آنکھ سے بچا کر جرائم کر رہے ہوتے ہیں اور معاشرے میں بڑھتی ہوئی اس ریت و روایت کو سختی سے ختم کرنے کا یہی بہترین وقت ہے اور اسی وجہ سے عدالت نے صراحت کے ساتھ حکم دیا کہ کسی بھی زاتی گاڑی کے نمبر پلیٹ پر اپنے پیشے چاہے وہ کوئی بھی پیشہ ہو کے حوالے کوئی بھی نشانی نہیں ہوگی اور گاڑیوں پر صرف حکومت کی جانب سے جاری ہونے والے نمبر پلیٹ ہوں گے اور بقیہ تمام انواع و اقسام کے نمبر پلیٹ تمام گاڑیوں سے سختی سے ہٹانے کا حکم دیا ہے۔

خلاصہ:

اس اہم کیس کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ ملزمان کی جانب سے سرکاری وغیرہ نمبر پلیٹ استعمال کرنے کی بڑھتی ہوئی روایت کے خلاف عدالت نے سخت الفاظ میں یہ فیصلہ دیا ہے کہ کسی بھی گاڑی کے نمبر پلیٹ پر پیشے کے حوالے سے کوئی نشانی نہیں ہوگی اور تمام زاتی گاڑیوں سے ایسے نمبر پلیٹ ہٹائے جائیں گے اور حکومت کی جانب سے جاری ہونے والے نمبر پلیٹ صرف قابل استعمال ہوں گے۔

سٹیچوٹری گراؤنڈ پر ضمانت کے حوالے سے سپریم کورٹ کا ایک انتہائی اہم اور تاریخ ساز فیصلہ[56]

محمد ذوالقرنین[57]

کیس کے حقائق:

روحان احمد نامی ملزم کے خلاف ۲۵مئی۲۰۲۰ کو ایف آئی اے سائبر کرائم ونگ کی جانب سے مجموعہ تعزیرات پاکستان کے دفعہ ۲۹۵-بی ، ۲۹۸ ، ۱۲۰-بی ، ۱۰۹، ۳۴ اور پیکا ایکٹ کے دفعہ ۱۱ کے تحت اس وجہ سے ایف آئی آر کا اندراج کیا جاتا ہے کہ ملزم روحان پر یہ الزام ہوتا ہے کہ اس نے شکایت کنندہ کو نہ صرف موبائل ایس ایم ایس بلکہ واٹس‌ایپ پر بھی گستاخانہ مواد بھیجا بلکہ بعد میں ایف آئی اے کی جانب سے چھاپے کے دوران گستاخانہ مواد برآمد بھی ہوا۔ ایف آئی اے کی جانب سے ایف آئی آر کے اندراج کے بعد ملزم کو ۲۶مئی۲۰۲۰ کو ہی گرفتار کیا جاتا ہے جس کے خلاف ملزم عدالت سے رجوع کر کے درخواست ضمانت دائر کر دیتا ہے لیکن ملزم کی یہ درخواست ۲۶اگست۲۰۲۱ کو خارج کر دیتی ہے جس کے بعد ملزم عدالت عالیہ لاہور سے نہ صرف میرٹ پر بلکہ سٹیچوٹری گراؤنڈ پر بھی ضمانت کی استدعا کرتا ہے لیکن ۲۲ اگست ۲۰۲۳ کو ملزم کی یہ درخواست بھی‌خارج کر دی جاتی ہے۔ عدالت عالیہ لاہور سے درخواست ضمانت خارج ہونے کے بعد ملزم کی جانب سے بدیں وجہ سپریم کورٹ میں لیو ٹو اپیل کی درخواست دائر کی جاتی ہے جس کو سپریم کورٹ کے تین رکنی بینچ بشمول جسٹس سید منصور علی شاہ صاحب ، جسٹس جمال مندوخیل صاحب اور جسٹس اطہر من اللہ صاحب کے سامنے مقرر کیا جاتا ہے۔

سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے کا آغاز اس نکتے سے کیا ہے کہ ملزم کو پولیس کی جانب ۲۷مئی ۲۰۲۰ کو گرفتار کیا گیا لیکن شومئ قسمت کہ ٹرائل کے دوران ملزم کی جانب سے ضابطہ فوجداری

---

[56] یہ انتہائی اہم فیصلہ، سپریم کورٹ کے جج ، جسٹس سید منصور علی شاہ صاحب نے لکھا ہے جس کو [کریمینل پیٹیشن نمبر ۸۹۴-ایل‌آف۲۰۲۳] کے طور پر پڑھا اور دیکھا جا سکتا ہے۔

[57] ایڈوکیٹ، قانون دان ٹیم پشاور و شریک بانی ٹیم آئین و قانون۔

کے دفعہ ۲۶۵-سی کے تحت ایک درخواست جمع کی جاتی ہے کہ مجھے وہ تمام کاغذات مہیا کئے جائیں جن کا ذکر پولیس رپورٹ میں ہے لیکن ٹرائل کورٹ ملزم کی یہ درخواست خارج کر دیتی ہے جس کے بعد ملزم ٹرائل کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف عدالت عالیہ لاہور سے رجوع کرتا ہے جس پر عدالت عالیہ نے ۷ ستمبر ۲۰۲۱ کو درخواست پر فیصلے کی بجائے ملزم کے خلاف کارروائی کو عدالت عالیہ کے فیصلے تک ملتوی کرنے کا حکم دے دیتی ہے جس کے بعد اصل مسئلہ یہاں پر پیدا ہوا کہ ملزم کی اس درخواست پر ایک طرف عدالت عالیہ کی جانب سے سماعت نہیں ہورہی تو دوسری طرف ملزم کے ٹرائل کی کاروائی بھی ملتوی ہے۔

سپریم کورٹ کی جانب سے مسئلے کی تہ تک پہنچنے کے بعد ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۴۹۷ میں مذکور سٹیچوٹری گراؤنڈ پر آتی ہے جس کے تحت اگر کوئی ملزم کسی ایسے الزام میں قید ہو کہ جس کی سزا؛ سزائے موت ہو تو ایسی صورت میں اگر ملزم کے قید میں دو سال گزر جائیں اور اس کے خلاف ٹرائل کا اختتام نہ ہو اگر ٹرائل میں تاخیر ملزم کی جانب سے نہ ہوئی ہو تو ملزم کا یہ آئینی و قانونی حق ہے کہ ملزم کو فی الفور ضمانت پر رہا کیا جائے۔ یہاں پر جسٹس صاحب نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ ملزم کو حاصل یہ حق صرف سٹیچوٹری نہیں بلکہ آئین پاکستان کے آرٹیکل ۹، ۱۴اور ۱۰-اے کے تحت یہ ملزم کا بنیادی آئینی حق ہے۔

مندرجہ بالا نکات کی صراحت کے ساتھ وضاحت کے بعد جسٹس منصور علی شاہ صاحب نے ایک بحث اس موضوع پر باندھی ہے کہ وہ کونسے ایسے عوامل ہیں جن کی موجودگی میں ملزم کو سٹیچوٹری گراؤنڈ دستیاب نہیں ہوگا تو اس بابت سپریم کورٹ نے لکھا ہے کہ ملزم کے خلاف یہ ثابت کیا جائے گا کہ اس نے قصدا ٹرائل کو موخر کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے لئے یہ واضح کیا جائے گا کہ ملزم نے مسلسل نے ٹرائل کے اہم مواقع یعنی جرح وغیرہ کے وقت ٹرائل کو ملتوی کرنے کی درخواستیں دی ہیں۔ یہاں پر جسٹس صاحب نے ایک انتہائی اہم نکتہ بیان کیا ہے کہ صرف درخواستوں کو شمار کرنے سے کام نہیں ہوگا کہ کس نے زیادہ درخواستیں ٹرائل کو موخر کرنے کے لئے دی ہیں اور چونکہ اس کیس میں تاخیر عدالت عالیہ کی جانب سے ہوئی ہے کیونکہ عدالت عالیہ نے ۳ سال گزرنے کے بعد بھی ملزم کی جانب سے پیش کی جانے والی درخواست پر فیصلہ نہیں دیا۔ یہاں پر جسٹس صاحب نے عدالت عالیہ کے پاس کیسز کو ملتوی کردینے کے

اختیار کے حوالے سے لکھا ہے کہ اگر ایک طرف عدالت کے پاس یہ اختیار ہے تو اس اختیار کا استعمال نہایت احتیاط کے ساتھ کرنا چاہیے اور ایک دفعہ یہ اختیار استعمال کیا جائے تو پھر درخواست پر جلد از جلد فیصلہ دینا چاہیے۔

سپریم کورٹ نے مندرجہ بالا امور واضح کرنے کے بعد ملزم کو ایک لاکھ روپے کے ضمانتی مچلکوں کے عوض ضمانت پر رہا کرنے کا حکم دیتے ہوئے اس کیس کو نہ صرف رپورٹ کرنے کی منظوری دی بلکہ عدالت عالیہ لاہور کے زریعے چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ کے سامنے رکھنے کا بھی حکم دیا تاکہ آئندہ ایسے امور میں بہتری آئے۔

خلاصہ:

فوجداری مقدمات میں سٹیچوٹری گراؤنڈ پر ضمانت کے حوالے سے اس تاریخ ساز فیصلے کا خلاصہ یہ ہے کہ ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۴۹۷ کے تحت ملزم کو حاصل سٹیچوٹری گراؤنڈ کے اس حق کو آئین پاکستان کے آرٹیکل چار ، نو اور دس اے کے تناظر میں دیکھا جائے گا اور بدیں وجہ ملزم کو اس حق کے حصول سے صرف اس وجہ سے محروم نہیں کیا جائے گا کہ ملتوی کرنے کی درخواستوں کو شمار کیا جائے بلکہ ملزم کو اس حق سے محروم کرنے کے لئے لازمی ہے کہ ملزم کے خلاف یہ ثبوت ہوں کہ اس نے قصدا مسلسل کوششوں کے زریعے ٹرائل کے اہم تاریخوں پر کیس کو موخر کیا ہے۔

سپرداری کے متعلق سپریم کورٹ کا فیصلہ[58]

ریاض احمد بٹ[59]

کیس کے حقائق:

[58]اس فیصلے کے مصنف جسٹس منصور علی شاہ ہیں اور [۲۰۲۳ایس،سی ایم،آر صفحہ ۱۱۷]کے حوالے کے تحت اس فیصلے کو ڈھونڈا جا سکتا ہے۔

[59]طالبعلم شریعہ اینڈ لاء، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

محمد اختر علی [درخواست گزار] نامی شخص اپنی گاڑی بمع اصل کاغذات فروخت کروانے کی نیت سے کار ڈیلر حاجی اظہر خان کے حوالے کرتا ہے۔ لیکن حاجی اظہر حبیب "خیانتِ مجرمانہ[60]" کا ارتکاب کرتے ہوئے رانا عبد الجبار [مدعا علیہ نمبر ۴] کو فروخت کرتا ہے، اس صورت میں نہ تو درخواست گزار کو گاڑی کا معاوضہ دیا جاتا ہے اور نہ ہی اس کو گاڑی واپس کی جاتی ہے۔ جس پر درخواست گزار مجموعۂ تعزیرات پاکستان کے دفعہ ۴۰۶ جو کہ خیانتِ مجرمانہ کی سزا کے متعلق ہے، کے تحت ایف آئی آر درج کرواتا ہے۔

درخواست گزار اور مدعا علیہ نمبر ۴ دونوں گاڑی کی سپرداری کے لیے اپنی اپنی درخواستیں جمع کرتے ہیں، متعلقہ مجسٹریٹ، محمد اختر علی [درخواست گزار] کی درخواست مسترد کرتے ہوئے رانا عبدالجبار [مدعا علیہ نمبر ۴] کی درخواست سپرداری منظور کرتا ہے، درخواست گزار[پٹیشنر] اس آرڈر کے خلاف نظرثانی کی درخواست دیتا جو مسترد کی جاتی ہے۔

لاہور عدالت عالیہ، ملتان بینچ سے رجوع کرنے پر بھی اس آرڈر کو برقرار رکھا جاتا ہے اور آخر میں درخواست گزار عدالت عظمی سے رجوع کرتا ہے۔

عدالت کے سامنے بنیادی سوال:

گاڑی کی متنازعہ ملکیت کی صورت میں سپرداری کا حقدار کون ہوگا؟

عدالتی کارروائی:

عدالت عظمی سندھ موٹر وہیکل اتھارٹی سے رپورٹ طلب کرتی، رپورٹ میں درخواست گزار گاڑی کا رجسٹرڈ مالک ہوتا ہے، اور اتھارٹی نے ہی اصل کاغذات ان کے حوالے کیے ہوتے ہیں، جبکہ مدعا علیہ نمبر۴ کے نام انتقالِ ملکیت کی کوئی درخواست ان کے رکارڈ میں نہیں ہوتی۔ چونکہ ظاہراً درخواست گزار ہی گاڑی کا مالک ہے، اس لیے سپرداری کا حقدار ہے۔

مزید برآں عدالت یہ قرار دیتی ہے کہ خواہ گاڑی کا قبضہ اور اصل رجسٹریشن بک مدعا علیہ نمبر 4کے پاس ہے اس کے باوجود یہ اس کو قانونی طور خریدار ثابت کرنے کے لئے ناکافی ہیں، کیونکہ درخواست گزار کا دعویٰ ہے کہ اس نے گاڑی ملزم[کار ڈیلر حاجی اظہر حبیب] کو برائے

[60] Criminal breach of trust.

فروخت دی تھی، اس نے گاڑی فروخت کر کے درخواست گزار کو معاوضہ نہ دے کر خیانتِ مجرمانہ کا ارتکاب کیا ہے جس کی وجہ ملزم [کار ڈیلر] اگر مدعا علیہ نمبر ۴ کے ساتھ کوئی بھی معاہدہ فروخت کرتا ہے جو درخواست گزار کی طرف سے باقاعدہ طور پر انتقال نامہ پر نہیں ہوتا، وہ قانونی طور پر مؤثر نہ ہوگا۔

عدالت کا فیصلہ:

عدالت عظمیٰ درخواست گزار کے حق میں سپرداری کی درخواست منظور کرتی ہے، ہائی کورٹ کے آرڈر کو مسترد کر دیتی ہے، اس پٹیشن کو اپیل میں تبدیل کردیتی ہے اور یہ قرار دیتی ہے کہ اگر درخواست گزار ۲۰ لاکھ روپے کے ضمانتی مچلکے جمع کرتا ہے تو گاڑی اس وقت تک سپرداری پر اس کو دی جائے گی جب تک ملکیت کا حتمی فیصلہ نہیں ہوتا۔

ملکیت متنازع ہونے کی صورت میں سپرداری حکومتی ریکارڈ میں رجسٹرڈ مالک کو دی جائے گی، فقط قبضہ رکھنے یا اصل کاغذات رکھنے سے ملکیت ثابت نہیں ہوگی۔

راضی نامے کی بنیاد پر فوجداری مقدمے سے بری ہونے کے، باعزت بری ہونے یا نہ ہونے کے حوالے سے لاہور ہائی کورٹ کا فیصلہ[61]

محمد مخدوم شاہ[62]

کیس کے حقائق:

محمد اکرم[مدعا علیہ] کو ۲۶اپریل۲۰۱۹ کو سِول سرونٹس ایکٹ ۱۹۷۳ کے تحت اپیلیٹ ٹرائبونل اِنلینڈ ریونیو[63] اسلام آباد میں۱ سال کے پروبیشنری مدت کے لئے ,بطور جوڈیشل ممبر تعینات کیا

[61]اس فیصلے کے مصنف جسٹس جواد حسن ہیں اور اس فیصلے کورٹ پیٹیشن نمبر۱۹۸۳آف ۲۰۲۳ کے تحت ڈھونڈا کیا جا سکتا ہے۔

[62]طالب علم شریعہ و قانون،بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، اور ان کو shahsaib448@gmail.com کے زریعے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

[63] Appellate Tribunal Inland Revenue

جاتا ہے۔درخواست گزار اس تعیناتی کے خلاف ۴ سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد آئینِ پاکستان کے آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت رِٹ پیٹیشن [کوورنٹو][64] دائر کرتا ہے۔۔

درخواست گزار کی گزارشات:

یہ کہ ماضی سال۲۰۰۵ میں ریسپانڈنٹ کے خلاف ایف آئی آر درج ہو چکی ہے اور وہ فوجداری مقدمے میں ملوث رہے ہیں گو کہ اس کیس کو راضی نامہ کے ذریعے ،نا کہ میرٹ کی بنیاد پر ختم کیا گیا تھا۔ لیکن چونکہ راضی نامہ کے تحت بَری ہونا' با عزت بَری ہونا 'نہیں ہوتا لہٰذا مدعا علیہ قانوناً) مذکورہ قانون کے دفعہ ۲ کے پرووائزو کے تحت اس تعیناتی کے لیے اہل نہیں۔

مدعا علیہ کی گزارشات:

ایڈیشنل اٹارنی جنرل نے اعتراض اٹھایا کہ غیر معقول اور غیر معمولی تاخیر[65] کے بنیاد پہ یہ مقدمہ قابلِ سماعت نہیں ہے۔

اسسٹنٹ اٹارنی جنرل نے عدالت کو بتایا کہ مدعا علیہ کی تعیناتی انکم ٹیکس آرڈیننس ۲۰۰۱ کے دفعہ ۱۰ میں مذکور شرائط و قیود پر سختی سے عمل کرتے ہوئے کی گئی ہے۔

مزید برآں، مدعا علیہ کے وکیل نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ چونکہ یہ مقدمہ مدعا علیہ کو محض بدنام کرنے کے غرض سے درج کیا گیا ہے لہٰذا نا قابلِ سماعت ہے۔ مزید یہ کہ تعیناتی سے قبل وہ تمام کریمنل چارجز سے باعزت طور پر بری ہو چکے تھے کیونکہ راضی نامہ کی بنیاد پر بری ہونا دراصل "باعزت بری ہونا" ہی ہوتا ہے۔

بنیادی سوالات:

1. کیا راضی نامہ کی بنیاد پر فوجداری مقدمے سے بری ہونے کو" باعزت بری ہونا" قرار دیا جا سکتا ہے؟
2. آیا انکم ٹیکس آرڈیننس پروبیشنری مدت کے دوران کردار کی تصدیق سے متعلق کوئی پابندیاں یا شرائط فراہم کرتا ہے؟
3. آیا [کوورنٹو] رِٹ قابلِ سماعت ہے؟

---

[64] Quo warranto

[65] Grounds of Laches

4. آیا اس مقدمے پر قانون میعاد کا اطلاق ہوتا ہے؟

پہلے سوال کے جواب میں عدالت نے دونوں اطراف کے دلائل سننے کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مدعا علیہ کے خلاف ایف آئی آر اس کے چچا نے جائیداد کے کسی تنازعے کے ضمن میں درج کی تھی لیکن بعد میں مسئلے کو باہمی رضا مندی سے راضی نامہ کے ذریعے رفع دفع کیا گیا۔ لہٰذا ٹرائل کورٹ اور بعد ازاں سیشن کورٹ نے بھی مدعو علیہ کو مقدمے سے بری کر دیا۔

یہ بات واضح ہے کہ کسی شخص کے " قانوناً غلط کردار" کو ثابت کرنے کے لئے فقط ایف آئی آر کے اندراج کو معیار نہیں مانا جا سکتا۔ اور جہاں تک بات "باعزت بری ہونے" کی ہے تو عدالت یہ سمجھتی ہے کہ کوئی بھی' بَری ہونا 'بشمول' راضی نامہ کے بنیاد پر بَری ہونا"با عزت بَری ہونا" ہی ہوتا ہے اس وجہ کی وجہ یہ ہے کہ استغاثہ[پراسیکیوشن]ملزم کے خلاف اپنے کیس کو ناقابل تردید شہادت کی بنیاد پر ثابت نہیں کر سکی .مزید یہ کہ بَری ہونے میں "باعزت" اور" ذلت آمیز" بَری ہونے کی کوئی تقسیم نہیں ہوتی، کوئی بھی بَری ہونا باعزت ہی ہوتا ہے۔

دوسرے حل طلب سوال کے جواب کے لئے دفعہ ۱۳۰ کی ذیلی دفعہ ۳ کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

دفعہ ۱۳۰ ذیلی دفعہ ۳ :کسی ایسے شخص کو اپیلٹ ٹریبونل میں بطور جوڈیشل ممبر تعینات کیا جا سکتا ہے اگر وہ شخص:

I. ڈسٹرکٹ جج رہا ہو اور ہائی کورٹ کا جج بننے کا اہل ہو۔

II. ہائی کورٹ کا وکیل ہو یا رہا ہو اور ہائی کورٹ کا جج بننے کا اہل ہو۔

III. اِنلینڈ ریوینیو سروس میں بی پی ایس ۲۰ یا اس سے اوپر کا افسر ہو اور قانون کا گریجویٹ ہو۔

دفعہ ۱۳۰ کی ذیلی دفعہ ۳ کی عبارت کو دیکھتے ہوئے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ,پروبیشنری مدت کے دوران ,کردار کی تصدیق سے متعلق کوئی پابندی یا شرائط فراہم نہیں کرتی .نا ہی یہ ایسی کسی شرط کی بات کرتی ہے جس سے یہ مطلب اخذ کیا جائے کہ کسی شخص کے خلاف محض ایف آئی آر کا اندراج اس کو بطور ممبر جوڈیشل تعیناتی سے روک دے گی۔

تیسرے سوال کے جواب کے لئے آرٹیکل ۱۹۹ کا متعلقہ حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

آرٹیکل ۱۹۹: اگر کسی عدالتِ عالیہ کو اطمینان ہو کہ قانون میں کسی اور مناسب چارہ جوئی [ریلیف] کا انتظام نہیں ہے،
تو وہ دستور کے تابع، کسی شخص کی درخواست پر بذریعہ حکم، کسی شخص کو، جو اس عدالت کے علاقائی اختیار سماعت میں کسی سرکاری عہدے پر فائز ہو، یا جس کا فائز ہونا مترشّح ہوتا ہو اس کو حکم دے سکے گی کہ وہ ظاہر کرے کہ وہ کس قانونی اختیار کے تحت اس عہدے پر فائز ہونے کا دعویدار ہے ؟

درج بالہ عبارت اور متعلقہ نظائر کا باریک بینی سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے؛کہ [کوورنٹو] کی رِٹ کے قابلِ سماعت ہونے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ درخواست لازماً متاثرہ شخص کی طرف سے ہی ہو بلکہ کسی بھی شخص کی طرف سے ہو سکتا ہے،یہ کہ درخواست کی نیک نیتی اور چال چلن قابلِ اعتبار ہو،یہ کہ [کوورنٹوِرٹ] کے ضمن میں ریلیف دینا عدالت کا صوابدیدی اختیار ہے لیکن باجود اس کے عدالت پر لازم ہے کہ [کوورنٹو]استثنائی کیسز میں جاری کرے۔ موجودہ مقدمے میں درخواست گزار کی نیک نیتی کے نہ ہونے ,غیر منطقی محرکات، اوردرخواست کی غیر سنجیدگی کے باعث عدالت یہ قوی یقین رکھتی ہے کہ اس درخواست کا خارج ہونا لازم ہے۔

آخری سوال میں عدالتِ عظمٰی کے نظائر کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ امر واضح ہوتا ہے کہ قانون میعاد اس مقدمے پر لاگو ہوتا ہے اور اس نوعیت کے مقدمات کے لئے ۳ مہینے کے وقت کو معقول اور کافی مانا جاتا ہے۔لہٰذا رٹ پیٹیشن خارج کی جاتی ہے۔

"میرانڈا" رول[66]، دوران تفتیش اور ٹرائل مرضی کا وکیل کے حوالے سے لاہور ہائی کورٹ کا ایک اہم فیصلہ[67]

طاہر خان وزیر [68]

کیس کے حقائق:

محمد شاہد اپیل کنندہ ہمراہ سغیر احمد، شہزاد احمد، عامر بشیر کے خلاف مجموعہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۴۹، ۱۴۸، ۳۲۴، ۳۰۲، کے تحت ایف آئی آر درج ہوتی ہے۔ اس میں محمد شاہد کو سزائے موت، ۱۰ سالہ قید بامشقت اور ۳ سالہ قید بامشقت سزائیں سنائی جاتی ہیں۔ باقی میں سے ایک اشتہاری جب کہ ۱۲ الزامات سے بری قرار دے دیئے جاتے ہیں۔

بنیادی سوال:

سزائے موت کے کیس میں کیا بغیر وکیل کے ملزم کو کنفیشنل سٹیٹمنٹ کی بنیاد پر سزا سنائی جاسکتی ہے؟۔

اس فیصلہ کی اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں "میرانڈا" رول کو ریپروڈیوس کیا گیا ہے جو کہ پاکستان عدالتی جورس پروڈنس کے تناظر میں ایک نیا زاویہ ہے۔

عدالت کا فیصلہ:

ٹرائل کورٹ کا یہ فیصلہ ہائی کورٹ میں چیلنج کیا جاتا ہے۔ ہائی کورٹ نوٹ کرتی ہے کہ اپیل کنندہ کی حد تک چارج جب فریم کی جاتی ہے تو وہ صحت جرم سے انکار کرتے ہوئے الزام مسترد کرتے ہے۔ شہادت کے سٹیج پر پہلی سماعت پہ مستغیث[69] کے وکیل کی عدم دستیابی پر کیس اگلے دن تک ملتوی کر دیا جاتا ہے جس دن اپیل کنندہ کے وکیل نہ ہونے کی وجہ سے سماعت نہیں ہو پاتی۔ اپیل کنندہ کے بھائی وکیل کو کرنے کے لیے ٹرائل کورٹ سے وقت لیتے ہے۔ اگلی سماعت پہ اپیل کنندہ کنفیشنل سٹیٹمنٹ ریکارڈ کرنے کے ارادہ کا اظہار کرتے ہیں۔ ٹرائل کورٹ کے اس سماعت کے عبوری حکم نامہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپیل کنندہ کے اس عمل کے پیچھے "وکیل انگیج" نہ کر سکتا

---

[66] Rule

[67] اس فیصلے کے مصنف جج، جسٹس جناب سید مظاہر علی اکبر نقوی ہے اور اسے [۲۰۱۰ پی۔ سی آر۔ ایل۔ جے صفحہ ۸۱۲] یا "محمد شاہد بنام سرکار" کے طور پر تلاش کیا جاسکتا ہے۔

[68] ایڈووکیٹ و ممبر ٹیم آئین و قانون۔

[69] Prosecution.

ہے۔اس بناپر ٹرائل کورٹ اپیل کنندہ کے لیے سٹیٹ کونسل مقرر کرتی تاہم اپیل کنندہ کنفیشنل سٹیٹمنٹ[وہ بیان جس میں تمام جرائم کو قبول کیا جاتا ہے] ریکارڈ کرنے پر بضد رہتے ہے۔مذکورہ وکیل اپنا وکالت واپس لیتے ہے۔ یوں ٹرائل کورٹ ان کی کنفیشنل سٹیٹمنٹ ریکارڈ کرتی ہے۔[واضح رہے یہ بیان ریکارڈ کراتے وقت ان کا کوئی وکیل نہیں ہوتا] اگلی سماعت پہ ایک اور وکیل سرکار کے خرچے پہ اپیل کنندہ کے لیے مقرر کیا جاتا ہے۔اس کنفیشنل سٹیٹمنٹ کی بنیاد پہ اپیل کنندہ کو سزاوار ٹھہرادیا جاتا ہے۔

معزز عدالت دیکھتی ہے کہ دفعہ ۳۰[۱] مجموعہ ضابطہ فوجداری کے تحت ملزم اپنے لیے وکیل انگیج کرنے کا حق رکھتا ہے۔آرٹیکل ۱۶۱ قانون شہادت آرڈر کے تحت اگر عدالت سزائے موت کے کیسز میں گواہان پر جرح کرنے کے لیے کونسل مقرر نہیں کرتی تو پر لازم ہو جاتا ہے کہ سچائی تک پہنچنے کے لیے خود گواہان پر جرح کریں۔

معزز عدالت نوٹ کرتی ہے کہ اس کیس میں ٹرائل کورٹ نے نہ صرف زیر دفعہ ۲۰ کے تحت وکیل مقرر نہیں کیا بلکہ آرٹیکل ۱۶۱ قانون شہادت آرڈر کے تحت اپنا فرئضہ انجام دینے میں بھی ناکام رہی۔

عدالت قرار دیتی ہے کہ آئین پاکستان کا آرٹیکل ۱۰[۱] ہر شہری کو اپنی مرضی کا وکیل کرنے کا حق دیتا ہے جو کہ ""میرانڈا"رول سے مطابقت رکھتا ہے۔عدالت میرانڈا بنام ایریزونا کیس کے طے کردہ ۱۴اصول ریپر وڈیوس کرتی ہے:

1. دوران تفتیش ملزم کو مطلع کیا جائے گا کہ کسی سوال کا جواب نہ دینے کی صورت میں خاموشی اختیار کرنا ان کا حق ہے۔
2. مشتبہ شخص کو خبردار کیا جائے گا کہ جو کچھ بھی وہ کہے وہ ان کے خلاف عدالت میں استعمال ہو سکتا ہے۔
3. مشتبہ شخص دوران تفتیش بھی وکیل کا حق رکھتا ہے۔
4. اگر کوئی شخص وکیل کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہوں تو دوران تفتیش ریاست ان کو وکیل مہیا کرے گی۔

مندرجہ بالا بحث سے معزز عدالت اس نتیجہ پر پہنچی کہ ملزم اپنی مرضی کا وکیل کرنے کا حق رکھتا ہے۔اگر وہ وکیل کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہوں تو ریاست اسے ایسا وکیل مہیا کرے گی جس پر اس کا اعتماد ہوں۔ اس کیس میں ٹرائل کورٹ نے اپیل کنندہ کو بنیادی حق سے محروم رکھا ہے۔حتیٰ کہ میرٹ پہ بھی اگر دیکھا جائے تو اپیل کنندہ نے

صحت جرم سے انکار کے چند دن بعد ہی کنفیشنل سٹیٹمنٹ ریکارڈ کرنے کی حامی بھری، وہ بھی وکیل انگیج کرنے میں ناکامی کے بعد۔

عائلی فیصلے

انتقال وراثت کی میعاد سماعت اور اصول رضامندی کے حوالے سے سپریم کورٹ کا ایک انتہائی اہم فیصلہ[70]

محمد ذوالقرنین[71]

کیس کے حقائق:

جلال شاہ نام کا ایک مورث اعلیٰ جو کہ ۱۹۶۳ میں فوت ہوکر اپنے ورثاء میں دو بیٹے یعنی مشتاق علی شاہ اور سید علی شاہ کے لئے ترکے میں ایک ۱۱۴ کنال اور ۱۴مرلے زمین چھوڑ دیتے ہیں اور مندرجہ بالا وراثتی حصہ دسمبر۱۹۶۵ کو انتقال نمبرا۷ کے زریعے مندرجہ بالا دونوں بیٹوں کو منتقل ہوجاتی ہے اور مندرجہ بالا انتقال کے مطابق جلال شاہ کے صرف یہی دو ہی بیٹے ہوتے ہیں لیکن یاد رہے کہ جلال شاہ کی ایک بیٹی غلام فاطمہ بھی ہوتی ہے لیکن وہ اپنے مرحوم باپ سے پہلے ہی ۱۹۶۰ میں فوت ہوئی ہوتی ہیں اور غلام فاطمہ کی اولاد میں ۳ بیٹیاں جن میں امت العزیز ، اختر اور صفدر بی بی شامل ہیں۔ جلال شاہ کی نواسی امت العزیز یعنی غلام فاطمہ کی بیٹی ۹ فروری۲۰۰۸کو ریونیو اتھارٹی کے پاس [مسلم فیملی لاءآرڈیننس،۱۹۶۱] کے دفعہ ۴ کے تحت انتقال نمبر ۷۱ کی تصحیح کے لئے ایک درخواست جمع کرتی ہیں لیکن ریونیو اتھارٹی ان کی درخواست کو مسترد

---

[70] اس فیصلے کے مصنف جج جسٹس قاضی فائز عیسی ہے اور اسے [۲۰۲۲ایس۔سی۔ایم۔آر صفحہ ۱۵۵۸] کے طور پر تلاش کیا جاسکتا ہے۔

[71] ایڈووکیٹ، پشاور بار ایسوسی ایشن و ممبر ٹیم ممبر آئین و قانون۔

کردیے ہیں جس کے بعد امت العزیز ۲فروری۲۰۱۲ کو سول جج کی عدالت میں تنسیخ انتقال نمبر ۱۷اور دعویٰ استقرار حق جمع کرتی ہیں لیکن دوران مقدمہ ۷جولائی۲۰۱۳ کو امت العزیز کا انتقال ہوجاتا ہے جس کے بعد اس کے شوہر اور بیٹے عدالت سے وہ مقدمہ اس اجازت کے ساتھ واپس لے لیتے ہیں کہ وہ نیا مقدمہ درج کریں گے جس کے بعد ۲جون۲۰۱۴ کو امت العزیز کا شوہر اور بیٹا ایک نیا مقدمہ دائر کر دیتے ہیں جو کہ ان کے حق میں فیصلہ بھی ہوجاتا ہے اور اسی فیصلے کے خلاف اپیل اور رویجن پیٹیشن بھی خارج ہوجاتی ہے جس کے بعد یہ مقدمہ سپریم کورٹ پہنچ ہوجاتا ہے اور سپریم کورٹ میں یہ مقدمہ دو رکنی بینچ جو کہ جسٹس قاضی فائز عیسیٰ اور جسٹس یحییٰ آفریدی پر مشتمل ہوتا ہے کہ سامنے لگ جاتا ہے۔

- نوٹ :سپریم کورٹ میں اس کیس کی سماعت سے پہلے کچھ اہم باتیں جن کا یہاں زکر ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جلال شاہ کا پہلا بیٹا مشتاق علی شاہ ۱۹۸۹ میں فوت ہوا ہوتا ہے اور ان کے حصے کی زمین کا انتقال ان کے ورثاء کے نام ہوا ہوتا ہے لیکن بعد میں ان کے ورثاء ایک مصباح الحسن نامی تیسرے فریق کو اپنی زمین بیچ کر ان کے حق میں انتقال کر دیتے ہیں۔ یاد رہے کہ جلال شاہ کا دوسرا بیٹا سید علی شاہ ۱۹۹۲ میں فوت ہوا ہوتا ہے اور اس کے حصے کی زمین کا انتقال بھی اس کے ورثاء کے نام ہوا ہوتا ہے لیکن بعد میں اس کے ورثاء بھی اپنے ایک کوثر علی شاہ نامی شریک وارث کو بیچ کر انتقال اس کے حق میں کر دیتے ہیں اور بعد میں کوثر علی شاہ نام کا یہ وارث اپنے وراثتی حصے سمیت بیع شدہ حصے کو بھی ایک اور فریق تقی ڈویلپرز کو بیچ کر انتقال ان کے نام کردیتے ہیں۔ یاد رہے کہ تقی ڈویلپرز نے یہ زمین حاصل کرنے کے بعد وہاں پر ایک فاطمہ ویلی ہاؤسنگ کے نام سے ایک رہائشی سکیم کا آغاز کیا اور یہ منصوبہ سی ڈی اے سے باقاعدہ منظور ہونے کی وجہ سے وہاں پر ۴۴۴ لوگوں نے پلاٹس بھی لئے ہوئے تھے۔

ٹرائل کورٹ ، اپیلٹ کورٹ اور رویجنل کورٹ سے یہ کیس امت العزیز کے حق میں فیصلہ ہونے کے بعد جب یہ کیس سپریم کورٹ کے سامنے گیا تو کوثر علی شاہ نامی فریق جنھوں نے یہ زمین تقی ڈویلپرز کو بیچی تھی کی جانب سے سپریم کورٹ میں دلائل دئے گئے کہ یہ زمین کوثر علی

شاہ نے تقی ڈویلپرز کو ۱۵نومبر۲۰۰۷ کو انتقال کے زریعے منتقل کی اور تب کسی کی طرف سے کوئی بھی اعتراض نہیں کیا گیا حالانکہ اگر اعتراض ہوتا بھی تو وہ ۱۹۶۳ میں ہوتا جب جلال شاہ فوت ہوئے تھے اور تب سے لے کر کوئی بھی اعتراض نہیں کیا گیا اور امت العزیز کے شوہر کے عدالت میں بیان کے مطابق امت العزیز نے اپنے بھائیوں سے زمین ۱۹۹۲ میں پہلی مرتبہ مانگی تھی تو اس لئے کاز آف ایکشن ۱۹۹۲میں بنتا ہے اور قانون میعاد سماعت [لیمیٹیشن ایکٹ]کے دفعہ ۱۹۱ کے مطابق لمیٹشن کا عرصہ اس کیس میں ۳ سال ہے اور دفعہ ایک سو بیس کے مطابق دعویٰ استقرار حق جب وہ ملکیت کے حوالے سے ہو تو اس صورت میں لمیٹشن ۶ سال ہے لیکن امت العزیز نے تقریباً ۱۶ سال بعد ۲۰۰۰ میں پہلی مرتبہ کوئی درخواست دی اور ۲۰سال بعد عدالت میں کیس کیا تو اس وجہ سے امت العزیز کا یہ کیس ٹائم بارڈ ہے ۔ کوثر علی شاہ کی جانب سے ان دلائل کے جواب میں امت العزیز کی جانب سے کہا گیا کہ وہ ایک اکیلی لاچار عورت تھی جس کے جواب میں کہا گیا کہ وہ اکیلی نہیں بلکہ شادی شدہ عورت تھی ۔ یاد رہے کہ تقی ڈویلپرز کی جانب سے[ٹرانسفر آف پراپرٹی ایکٹ]کے دفعہ۴۱ پر بھی انحصار کیا گیا اور عدالت عظمیٰ کے ۲ مشہور عدالتی نظائر گرانہ بنام صاحب کمالہ بی بی[72] اور انٹلیجنس بیورو بنام شبیر حسین[73] پر بھی انحصار کیا گیا۔ دوسری جانب یعنی ریسپانڈنٹس کی جانب سے ٹرائل کورٹ ، اپیلٹ کورٹ اور ریونیو کورٹ کے فیصلوں پر انحصار کے ساتھ ساتھ یہ بھی نکتہ اٹھایا گیا کہ وراثتی معاملات میں کوئی لمیٹشن نہیں ہوتی اور اسی نکتے کے لئے سپریم کورٹ کے مختلف عدالتی نظائر پر انحصار کیا گیا ۔

عدالت کا فیصلہ:

فریقین کے دلائل مکمل ہونے کے بعد سپریم کورٹ کے فاضل جج قاضی فائز عیسیٰ نے فیصلے کا آغاز انتقال نمبر۱۷ سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ امت العزیز کی جانب سے مندرجہ بالا انتقال کو تقریباً ۴۵ سال بعد پہلی مرتبہ ۲۰۰۸ میں ریونیو اتھارٹی کے سامنے چیلنج کیا گیا جنھوں نے اس

---

[72] پی ایل ڈی ۲۰۱۴ سپریم کورٹ صفحہ ۱۶۷۔

[73] ۲۰۲۲ ایس، سی، ایم، آر صفحہ ۹۷۷۔

درخواست کو مسترد کیا اور پھر عدالت نے اپنے فیصلے میں ریونیو اتھارٹی کے فیصلے کا ایک پیراگراف نقل کیا ہے جس کے مطابق ریونیو اتھارٹی لانگ سٹینڈنگ انتقالات میں کوئی تغیر یا تبدیلی نہیں کر سکتی۔ اس پیراگراف کے بعد جسٹس صاحب نے لکھا ہے کہ امت العزیز نے بجائے ریونیو اتھارٹی کے اس فیصلے کو چیلنج کرنے کے دیوانی مقدمہ دائر کیا۔ مقدمے میں موجود چند خامیوں کی طرف اشارہ کرنے کے بعد جسٹس صاحب نے لکھا ہے کہ ان خامیوں میں پڑنے کی بجائے اس کیس میں ہماری نظر میں مندرجہ ذیل نکات سب سے اہم ہیں۔ یاد رہے کہ مندرجہ ذیل وہ نکات ہیں جو اس اہم فیصلے کی تلخیص کا باعث بنے ۔

جسٹس صاحب کے مطابق انتقال وراثت میں دو طرح کے کیسز ہوتے ہیں جن میں ایک یہ جب کوئی فریق یہ دعویٰ کرے کہ اس کے وراثتی حصے کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا گیا اور اس کے حصے کا اندراج بھی انتقال میں نہیں ہوا جب کہ دوسرے کیسز یہ آتے ہیں کہ وارث خود خاموش اور بیکار بیٹھا رہے اور اس کی جانب سے تب تک کوئی دعویٰ نہیں کیا جاتا جب تک کوئی تیسرا فریق نہ آئے تو ایسے کیسز میں متاثرہ فریق کے لئے یہ ثابت کرنا لازمی ہوتا ہے کہ اس کو وراثت سے محروم اس کی لاعلمی میں کیا گیا اور دوسری بات اس کے لئے یہ بھی ثابت کرنا لازمی ہے کہ خریدار اور بیچنے والے کے درمیان کوئی سازباز ہوئی ہے اور تیسری بات یہ کہ اس کے لئے یہ بھی ثابت کرنا لازمی ہوگا کہ خریدنے والے کو اس کے حق کا پتہ تھا لیکن اس کے باوجود اس نے یہ زمین خریدی۔

سپریم کورٹ کی جانب سے مندرجہ بالا نکات کی طرف اشارہ کرنے کے بعد کہا گیا کہ نچلی عدالتوں میں سے کسی نے بھی ان نکات کی طرف غور نہیں کیا کہ اس کیس میں تیسرے فریق کے حقوق بھی شامل ہوچکے ہیں اور بالخصوص تیسرے فریق کے حقوق امت العزیز کی جانب سے انتقال چیلنج ہونے سے پہلے ہی شامل ہوچکے تھے تو ایسی صورت میں تیسرے فریق کو خصوصاً جب اس کو نہ پارٹی بنایا گیا ہو اور نہ سنا گیا ہو تو ان کو محروم کرنا کسی بھی صورت قابل جواز نہیں ہوسکتا اور پھر اس نکتے کے لئے عدالت نے عدالت عظمیٰ کے مشہور دو عدالتی نظائر جن میں نمبر ایک گرانہ بنام صاحب کمالہ بی بی اور انٹیلیجنس بیورو بنام شبیر حسین پر بھی انحصار کیا گیا اور فیصلے کے آخر میں جسٹس صاحب نے لکھا ہے کہ نچلی عدالتوں نے عدالت عظمیٰ کے مندرجہ

بالا فیصلوں پر توجہ نہیں دی اور نہ ہی اصول رضامندی کی طرف اور نہ ہی زمین میں تیسرے فریق کے حقوق کی طرف اور نہ ہی انتقالات میں لانگ سٹینڈنگ انٹریز کی طرف اور نہ ہی اس طرف کہ امت العزیز نے پینتالیس سال تک کوئی دعویٰ نہیں کیا اور صرف اس وقت دعویٰ کیا جب زمین میں تیسرے فریق کے حقوق شامل ہوئے تو ان نکات کی روشنی میں سپریم کورٹ نے نچلی تینوں عدالتوں یعنی ٹرائل کورٹ ، اپیلٹ کورٹ اور ریونیو کورٹ کے فیصلوں کو ختم کرتے ہوئے امت العزیز کے کیس کو مسترد کر دیا اور تقی ڈویلپرز اور کوثر علی شاہ کے حق میں فیصلہ دے دیا ۔

خلاصہ:

خلاصہ کچھ یوں ہیں کہ انتقال وراثت میں دو طرح کے کیسز ہوتے ہیں جن میں ایک یہ جب کوئی فریق یہ دعویٰ کرے کہ اس کے وراثتی حصے کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا گیا اور اس کے حصے کا اندراج بھی انتقال میں نہیں ہوا جب کہ دوسرے کیسز یہ آتے ہیں کہ وارث خود خاموش اور بیکار بیٹھا رہے اور اس کی جانب سے تب تک کوئی دعویٰ نہیں کیا جاتا جب تک کوئی تیسرا فریق نہ آئے تو ایسے کیسز یعنی دوسرے قسم کے کیسز میں متاثرہ فریق کے لئے یہ ثابت کرنا لازمی ہوتا ہے کہ اس کو وراثت سے محروم اس کی لاعلمی میں کیا گیا اور دوسری بات اس کے لئے یہ بھی ثابت کرنا لازمی ہے کہ خریدار اور بیچنے والے کے درمیان کوئی سازباز ہوئی ہے اور تیسری بات یہ کہ اس کے لئے یہ بھی ثابت کرنا لازمی ہوگا کہ خریدنے والے کو اس کے حق کا پتہ تھا لیکن اس کے باوجود اس نے یہ زمین خریدی ہو تو اگر وہ یہ باتیں ثابت کردے تو تب اس کے حق میں فیصلہ ہوگا وگرنہ اگر یہ باتیں وہ ثابت کرنے میں ناکام رہے تو پھر اس کو خاموشی کی سزا وراثت سے محرومی کی صورت میں دیا جائے گا ۔

متبنیٰ[74] یعنی لے پالک کے حق حضانت سے متعلق لاہور ہائی کورٹ ملتان بنچ کا ایک اہم اور تاریخی نوعیت کا فیصلہ[75]

اسامہ محمد خان[76]

کیس کے حقائق:

مسمات آرزو نے اپنے حقیقی بیٹے محمد انس کی حق حضانت یعنی حوالگی کے لئے آئین پاکستان کے آرٹیکل ۱۹۹ اور مجموعہ ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۴۹۱ کو استعمال میں لاتے ہوئے عدالت عالیہ سے رجوع کیا کیونکہ اس کے بیٹے محمد انس کی کسٹڈی لے پالک کے طور پر پہلے سے رشید احمد نامی شخص کو حاصل ہوئی ہوتی ہے۔ محمد انس کی حضانت کا مسئلہ حل کرنے سے پہلے عدالت نے یہ سوال بھی ضروری سمجھا کہ کیا محمد انس حقیقتاً مسمات آرزو کا بیٹا ہے یا نہیں لہذا اسی بابت عدالت ھذا نے ایس ایچ او تھانہ تلمبہ ضلع خانیوال کو حکم دیا کہ مسمات آرزو اور محمد انس کو پنجاب فارنزک سائنس ایجنسی، لاہور لے جا کر انکے ڈی۔این۔ اے ٹسٹ کئے جائیں۔ڈی این اے ٹیسٹ کے بنیاد پر بنائے گئے رپورٹ میں مسمات آرزو ہی محمد انس کی حقیقی ماں ثابت ہوئی۔

بنیادی سوالات:

مندرجہ بالا قضیہ کے حل کے بعد عدالت نے حق حضانت کے مسئلے کی حل کی طرف بڑھتے ہوئے کچھ دیگر سوالات کے ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل تین سوالات کو بھی مد نظر رکھا:

1. لے پالک کی حیثیت اسلامی قانون میں کیا ہے؟
2. لے پالک کی کتنی اقسام ہیں اور ہر قسم میں بچے کی نسبت کس کو کی جائیگی؟
3. لے پالک بچے کے حق میں اگر وصیت نہیں کی گئی ہے تو کیا اسکو وراثت میں حصہ ملے گا یا نہیں؟

پہلے سوال کے جواب میں عدالت نے کہا کہ چونکہ لے پالک کا تصور پاکستان سمیت تمام مسلم دنیا میں زور پکڑتا جارہا ہے لہذا اب یہ ایک قابل غور مسئلہ بن گیا ہے لیکن یہ بھی یاد رہے کہ لے پالک کا مسئلہ کوئی نیا نہیں اور اس پر اسلام

---

[74] نوٹ : متبنیٰ یعنی لے پالک کو منہ بولا بیٹا بھی کہا جاتا ہے۔

[75] یہ انتہائی اہم فیصلہ لاہور ہائی کورٹ کے جج، جسٹس صادق محمود خرم صاحب نے لکھا ہے، اور اسے رٹ پیٹیشن نمبر ۱۲۸۲۶ آف ۲۰۲۳ کے طور پڑھا اور دیکھا جاسکتا ہے۔

[76] ایڈوکیٹ، پشاور بار ایسوسی ایشن۔

نے تب تک کوئی پابندی نہیں لگائی تھی جب تک کہ یہ انسانیت اور مسلم دنیا کے فلاح کے لئے تھی۔اس کی بہت ساری مثالیں اسلامی تاریخ کے اندر پائی جاتی ہیں کہ لے پالک کا تصور اسلام کے آنے سے پہلے بھی جزیرہ عرب میں موجود تھا، مثال کے طور پر:

- حضور پاک علیہ السلام کا حضرت زید رضی اللہ عنہ کو لے پالک کے طور پر قبول کرنا یہاں تک کہ بعد میں حضرت زید رضی اللہ عنہ کو زید بن محمد کے نام سے جانا جاتا تھا۔
- حضور علیہ السلام کا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے حوالے کرنا۔
- حضور خود ایک یتیم تھے اور انکے چچا ابو طالب نے انکی پرورش و پرداخت فرمائی تھی۔
- پاک مریم علیہ السلام کی نگہداشت حضرت زکریا علیہ السلام نے فرمائی جس کا ذکر قرآن میں بھی ہے۔
- بنی اسرائیل کے سب سے جلیل القدر پیغمبر حضرت موسی علیہ السلام کی پرورش فرعون کے گھر اسکی بیوی حضرت آسیہ (رضی اللہ عنہ) نے کی۔

اس جدید دور میں لے پالک بچوں کی ذمہ داری معاشرے اور ریاست کے ذمہ ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ قرآن کریم بڑی تاکید کے ساتھ یتیموں کی پرورش و پرداخت کے حقوق کی بات کرتا ہے، مثلا:

1: فاما الیتیم فلا تقھر (الضحی)[77]

2: ویطعمون الطعامہ علی حبہ مسکینا ویتیما واسیرا [الدھر][78]

یہاں پر ایک بات قابل غور ہے کہ لفظ یتیم کا معنی صرف وہ نہیں جن کے ماں باپ نہ ہوں اور وہ نابالغ ہوں بلکہ وہ بھی شامل ہیں جن کے سر براہ نہ ہوں۔

دوسرے سوال کے جواب کی طرف آتے ہوئے عدالت نے کہا کہ لے پالک میں صرف بچے کی جسمانی حوالگی کی بات نہیں بلکہ اس بچے کے تمام تر حقوق کا تعین بھی ہے اور اس سمیت یہ بات بھی قابل غور ہے کہ لے پالک بچے کی معاشرے، قانونی و دیگر دستاویزات میں شناخت اسکے حقیقی والدین کے نام سے ہوگی یا جنہوں نے اس بچے کو گود لیا ہے ان کے نام سے ہوگی؟۔ یہاں پر گود لینے والے بچوں کی دو اقسام بنتی ہیں ایک وہ جن کے حقیقی والدین کا

---

77 ترجمہ: سو جو یتیم ہو اس کو مت دبا۔

78 ترجمہ: اور اللہ کی محبت میں محتاج، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (الانسان)۔

پتہ ہے جبکہ دوسرے وہ جن کے حقیقی والدین کا بلکل پتہ نہ ہو۔ جہاں تک ان بچوں کی بات ہے جن کے حقیقی والدین معلوم ہوتے ہیں تو اس میں دین اسلام کے بلکل واضح تعلیمات ہیں کہ ان بچوں کو شناخت انکے حقیقی/طبعی والدین کی دی جائیگی اور اس میں قرآن کریم کے صریح آیات موجود ہیں:

- مَّا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ اللّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ۚ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ۔ (الاحزاب)[79]۔
- اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ مَوَالِيْكُمْ ؕ وَ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَ لٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔ (الاحزاب)[80]

مندرجہ بالا آیات ایسے ہر دو اقسام کے بچوں کے بارے میں وضاحت سے بات کرتا ہے کہ جن کے والدین معلوم ہوں یا نامعلوم لہذا لے پالک ہونے کا کوئی قانونی اثر اسلام میں نہیں بلکہ یہ صرف جذباتی اور نفسیاتی سکون کا سامان ہے۔

تیسرے سوال کے جواب میں عدالت نے کہا کہ جانشینی قانون ۱۹۸۵ کے مطابق متبنی یا منہ بولا بیٹا بلکل بھی وارث نہیں اور اگر (متبنی) لے پالک کے لئے وصیت نہیں کی گئی ہے تو میراث میں وہ کسی بھی قسم کے حصہ کا حقدار نہیں اور یہی قرین از انصاف بھی ہے کہ اگر ایک انسان کسی کا بیٹا ہی نہیں بنا ہے تو وہ کیونکر اسکے میراث میں حصہ دار مقرر ہو سکتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ منہ بولے بیٹے یعنی لے پالک ہونے کا کسی قسم کا قانونی اور شرعی اثر نہیں اگر لے پالک ہونے سے پہلے سے نہ ہو۔

---

[79] اللہ نے کسی بھی شخص کے سینے میں دو دل پیدا نہیں کئے، اور تم اپنی جن بیویوں کو ماں کی پشت سے تشبیہ دے دیتے ہو، اُن کو تمہاری ماں نہیں بنایا، اور نہ تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا قرار دیا ہے۔ یہ تو باتیں ہی باتیں ہیں جو تم اپنے منہ سے کہہ دیتے ہو، اور اللہ وہی بات کہتا ہے جو حق ہو، اور وہی صحیح راستہ بتلاتا ہے۔

[80] ترجمہ: منہ بولے بیٹوں کو ان کے حقیقی باپوں کی طرف منسوب کر کے پکارو، یہ اللہ کے نزدیک بہت انصاف کی بات ہے، پس اگر تمہیں ان کے حقیقی باپوں کا علم نہ ہو، تو وہ دین میں تمہارے بھائی اور دوست ہیں، اور اگر تم نے غلطی سے بلا ارادہ کہا ہے تو اس میں تم پر کوئی گرفت نہیں ہے لیکن اگر تم نے عمداً کہا ہے (تو اس پر گرفت ہو گی) اور اللہ بہت بخشنے والا بہت مہربانی کرنے والا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ نادرا کے مطابق معلوم بچوں کی نسبت انکے طبعی/حقیقی والدین کی طرف کی جائیگی جبکہ نامعلوم والدین والے بچوں کی نسبت کسی فرضی نام (والدین) کی طرف کی جائیگی لیکن اسکے لئے کافی ثبوتوں کا ہونا ضروری ہے تاکہ اس بچے کے حقوق و فرائض کا تعین ممکن ہو سکے اور اس وجہ سے دیگر بچوں کے حقوق بھی متاثر نہ ہوں۔ پاکستان میں ایسا کوئی خاص قانون نہیں جو کہ لے پالک کے بارے میں بات کرتا ہو البتہ لے پالک کے لئے حضانت/حوالگی کا طریقہ کار استعمال کیا جاتا ہے جو کہ گارڈین اینڈ وارڈز ایکٹ، ۱۸۹۰ میں درج ہے۔ یہاں تک کہ جانشینی قانون، ۱۹۸۵ میں بھی اس بارے میں کوئی تفصیلی بات نہیں کی گئی ہے۔

اب آتے ہیں اسکی عربی تعبیر کی طرف، یہ لفظ حضانت عربی زبان سے ماخوذ لفظ "حضانۃ" سے ہے اور اسکا مطلب شیر کے دونوں بغلوں کے درمیان کا فاصلہ ہے یعنی کہ سینہ اور دونوں بازوں کے درمیان جو کچھ ہے۔ اصطلاح میں اسکا مطلب بغل گیر ہونا ہی ماخوذ ہے۔ انگریزی زبان میں بھی اسکا مطلب بچے کی پرورش و پرداخت اور اسکو گلے لگانے کے ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لفظ "ولایۃ" کا جو استعمال "حضانۃ" کے معنی پر ہوتا ہے وہ درست نہیں۔ حضانت اصل میں سربراہی کی ایک قسم ہے اور اسکے لئے عورتیں زیادہ موزوں ہیں کیونکہ یہ بچے کا خیال رکھنے اور اسکی نگہداشت کرنے میں زیادہ ماہر ہوتی ہیں۔

خلاصہ:

اس اہم فیصلے کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ حضانت کا تعلق بچے کی حوالگی کے ساتھ ساتھ اسکی تربیت، تعلیم و تعلم، پرورش، نشو نما اور دیگر امور کے خیال رکھنے کے متعلق ہے اور ان تمام امور میں مرد و عورت میں سے سب سے زیادہ بچے کے امور پر قادر عورت ہوتی ہے لہذا دیگر مسائل کی غیر موجودگی میں کسی بھی بچے کی حضانت اس کی ماں کو دی جائیگی اور سب سے زیادہ حق دار وہی ہوگی اور اس ضمن میں بچے کی حوالگی سمیت تمام فوائد کو مد نظر رکھا جائے گا۔

والد کے خلاف بچے کے حق میں نان نفقے کا فیصلہ، کیا صرف والد کے خلاف ہی والد ہی خلاف قابل تنفیذ ہوگی یا دادا کے خلاف بھی قابل تنفیذ ہونے یا نہ ہونے کے حوالے سپریم کورٹ کا اہم فیصلہ[81]

طاہر خان وزیر

کیس کے حقائق:

محمد ریحان اپنے والدہ کے ذریعے والد [انصار عباس] سے نان نفقہ مانگنے کے لیے مقدمہ دائر کرتا ہے۔ مقدمہ ریحان کے حق میں ڈگری کیا جاتا ہے۔ محمد ریحان اس ڈگری کے نفاذ کے لیے درخواست دائر کرتا ہے۔ عدالت انصار عباس کے خلاف کاروائی عمل میں لاتی ہے مگر اس کے والد کا کوئی پتہ نہیں چلتا نہ اس کی کوئی پراپرٹی کا سراغ مل پاتا ہے۔اس دوران کیس میں ایک موڑ یہ آتا ہے کہ انصار عباس کے والد [بشیر احمد] یعنی ریحان کے دادا کی پراپرٹی ریحان کے نظر میں آتی ہے جو دادا کی پراپرٹی مذکورہ ڈگری کی مدد میں اٹیچ[قبضہ] کرنے کی درخواست عدالت میں دیتے ہے۔

ایگزیکیٹوٹنگ کورٹ کے سامنے ریحان کے دادا [پٹیشنر] یہ استدعا کرتے ہیں کہ چوں کہ وہ اس کیس میں فریق نہیں ہے لہذا ان کی پراپرٹی اٹیچ نہیں کی جاسکتی۔ لیکن عدالت ان کی درخواست مسترد کرتی ہے۔ یوں ریحان کی درخواست قبول کرتے ہوئے دادا کی پراپرٹی بچے کے نان نفقہ کی مد میں اٹیچ کر دی جاتی ہے۔ دادا اس آرڈر کے خلاف ہائی کورٹ میں درخواست دائر کرتے ہے جو کہ مسترد کی جاتی ہے۔ اس کے بعد معاملہ سپریم کورٹ آتا ہے۔

بنیادی سوال:

- عدالت کے سامنے سوال یہ تھا کہ کیا بچے کے والد کے خلاف پاس ہونے والی ڈگری بچے کے دادا کے خلاف بھی قابل نفاذ ہے یا نہیں، جبکہ بچے کے والد کا کوئی سراغ نہیں جس کے خلاف ڈگری نافذ کی جائے؟

[81] اس کیس کو سول پٹیشن نمبر ۵۹۸۱ آف ۲۰۲۱ کے طور پر تلاش کیا جا سکتا ہے۔ جس کے مصنف جج جسٹس سید منصور علی شاہ ہے،ان کے ساتھ بینچ میں جسٹس سید حسن اظہر رضوی اور جسٹس عرفان سعادت خان شامل ہے۔

عدالت اپنا فیصلہ "درست کام صحیح طریقے سے ہی کرنا چاہیے" کے اصول سے شروع کرتی ہے۔ عدالت اسلامی قانون زیر بحث لاتے ہوئے قرار دیتی ہے کہ بچے کے نان نفقے کی ذمے داری دادا کے کندھوں پر صرف دو صورتوں میں پڑ سکتی ہے :

1. اگر بچے کے والد کی معاشی حالت اس قابل نہ ہو کہ وہ بچے کے نان و نفقہ کا اہتمام کرسکے؛
2. دادا کے معاشی حالات بھی مشکل نہ ہو۔ عدالت اسلامی قانون کی اسی پوزیشن کے تناظر میں موجودہ کیس کو دیکھتے ہوئے قرار دیتی ہے کہ اسی اصول کے تحت کہ آیا کسی کیس میں یہ دو شرائط پورے ہوتے ہیں یا نہیں کے لیے ضروری ہے کہ دادا کو سنا جائے۔

آئین کے آرٹیکل ۱۰-اے کا تقاضہ ہے کیوں کہ نان نفقہ دینے کی صلاحیت رکھنے یا نہ رکھنے کا تعین شہری زمہ داری کا معاملہ ہے جس کے تعین کے لیے دادا کو منصفانہ سماعت اور حق دفاع کا حق دینا لازمی ہے۔

معزز عدالت مزید قرار دیتی ہے مندرجہ بالا دو شرائط امر واقعہ ہے، امر قانونی نہیں جس کا تعین ثبوت سامنے رکھ کر کیا جانا لازمی ہے۔ یہ ایگزیکٹیوٹنگ کورٹ کا کام نہیں ہے۔

یہاں عدالت قانون کے مسلمہ اصول کو بروئے کار لاتے ہوئے قرار دیتی ہے کہ اس کیس میں ایگزیکٹیوٹنگ کورٹ نہ تو ڈگری میں ردوبدل کرسکتی ہے اور نہ ہی ایسے شخص [اس کیس میں دادا جو کہ کیس میں فریق نہیں تھے] کے خلاف ڈگری نافذ کر سکتی ہے جو مقدمہ میں فریق نہ رہا ہو۔

فیملی قانون کے حوالے سے معزز عدالت قرار دیتی ہے کہ ایسے مقدمات کا طریقہ کار فیملی کورٹ ایکٹ ۱۹۶۴ میں دیا گیا ہے دادا کے خلاف بھی اسی ایکٹ کے تحت کاروائی ہو سکتی ہے اور یہی آئین کے آرٹیکل ۴ کا تقاضہ بھی ہے۔

مندرجہ بالا نکات واضح کرنے کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ بچے کے والد کے خلاف ڈگری دادا کے خلاف قابل نفاذ نہیں ہے۔ اس کے لیے بچے[پوتے] کو الگ مقدمہ دائر کرنا

ہوگا۔ اسی کے ساتھ عدالت نے بچے [پوتے] کو دادا کے خلاف الگ مقدمہ [اگر بچہ چاہے] کرنے کی اجازت دی۔

خلاصہ :

بچے کے والد کے خلاف ڈگری کا نفاذ بچے کے دادا کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ دادا کی بچے [پوتے] کی نان و نفقہ برداشت کرنے کی صلاحیت دو شرائط کے تعین سے مشروط ہے جس کے لیے بچے کو دادا کے خلاف الگ مقدمہ کرنا ہوتا ہے۔ ایگزیکیٹوٹنگ کورٹ کا یہ اختیار نہیں کہ وہ ڈگری میں ردوبدل کرے یا اس فریق کے خلاف ڈگری کا اجراء کرے جو مقدمہ کا حصہ نہ رہا ہو۔

تصور نان ونفقہ میں بچے کے تعلیمی اخراجات بھی شامل ہے، اس حوالے سے سپریم کورٹ کا ایک اہم فیصلہ[82]

طاہر خان وزیر[83]

کیس کے حقائق:

قدرت اللہ (پٹیشنر) اور مسماۃ شمع ناہید کے مابین شادی ہوتی ہے۔ شادی ٹوٹنے کے بعد شمع ناہید مسماۃ قرات العین (ان دونوں کی بیٹی) کے لیے نان ونفقہ کا دعویٰ دائر کرتی ہے۔ فیملی کورٹ ۱۰ اپریل ۲۰۰۷ کو یہ دعویٰ پاس کرتے ہوئے ۱ہزار روپے ماہانہ نان ونفقہ مقرر کرتی ہے۔ شمع ناہید یہ رقم بڑھانے کے لیے ۱۱ مارچ ۲۰۲۰ کو دعویٰ دائر کرتی ہے۔ فیملی کورٹ ماہانہ نان ونفقہ ۵ہزار روپے تک بڑھادیتی ہے۔ تاہم شمع ناہید اس مقدار کو مزید بڑھانے کے لیے ڈسٹرکٹ کورٹ میں اپیل کرتی ہے۔ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج یہ مقدار ۲۵ ہزار تک بڑھادیتی ہے۔ قدرت اللہ ہائی کورٹ میں رٹ کرتے ہیں جو کہ خارج کردی جاتی ہے۔ اس کے بعد کیس سپریم کورٹ میں آتا ہے۔

---

[82] اس کیس کے مصنف جج جسٹس سید حسن اظہر رضوی ہے اور ان کے ساتھ بینچ میں جسٹس سردار طارق مسعود اور جسٹس آمین الدین خان شامل ہے۔ اس کیس کو سول پٹیشن نمبر ۸-ایل آف ۲۰۲۳ یا "قدرت اللہ بنام ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج" کے طور پر تلاش کیا جاسکتا ہے۔

[83] ایڈوکیٹ و ممبر ٹیم آئین و قانون۔

عدالت کے سامنے بنیادی سوال:

کیانان ونفقہ میں بچے کے تعلیمی اخراجات بھی آتے ہیں اور باپ لامحدود ہائر لیول تعلیم کے حصول تک بھی بچے کے تعلیمی اخراجات اٹھانے کا زمہ دار ہے؟

درخواست گزار موقف اختیار کرتے ہیں کہ ان کا ذریعہ آمدن صرف پنشن ہے جس کی مقدار ۶۰ ہزار روپے ہے لہذا وہ ۲۵ ہزار روپے ماہانہ نان ونفقہ کسی صورت میں نہیں ادا کر سکتے۔ شمع ناہید موقف اختیار کرتی ہے کہ مذکورہ رقم قراۃ العین (جو کہ کامسیٹس یونیورسٹی میں چوتھی سمسٹر میں پڑھتی ہے) کے تعلیم جاری رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ معزز عدالت لفظ "نفقہ" سکوپ کچھ یوں متعین کرتی ہے۔

یہ سوال فریم کرتی ہے کہ کیا ایک مسلمان باپ بچے کی تعلیم پر آنے والے اخراجات کا بوجھ اٹھانے کا پابند ہے یا کیا بچے کی نان ونفقہ میں تعلیمی اخراجات بھی شامل ہے؟

معزز عدالت قرار دیتی ہے کہ نفقہ سے کسی کا خاندان پر خرچ کرنا مراد ہے۔ محمڈن لاء کے دفعہ ۳۶۹ کے مطابق نان ونفقہ کی تعریف کچھ اس طرح ہے: "نان ونفقہ میں خوراک، کپڑا اور مکان شامل ہے"[84]۔

معزز عدالت قرار دیتی ہے کہ اس دفعہ کے اندر نان ونفقہ کی تعریف جامع نہیں ہے، لفظ "Includes" کی وجہ سے نان ونفقہ کی تعریف کا سکوپ وسیع کیا جا سکتا ہے۔ عدالت ارسلان ہمایوں وغیرہ کیس پہ انحصار کرتے ہوئے قرار دیتی ہے کہ بچے کی سماجی، جسمانی، ذہنی نشوونما، دیکھ بھال اور فلاح کے مقاصد کے حصول کے لیے دفعہ ۳۶۹ کو وسیع معنی میں لیا جانا چاہیے۔ قرآنی فریم ورک بھی اس کی تائید کرتا ہے۔

معزز عدالت بین الاقوامی قانون کو زیر بحث لاتی ہے۔ یونائٹڈ نیشنز کنونشن آن دا رائیٹس آف دا چائلڈ ۱۹۸۹[85] جس کو پاکستان نے ریٹیفائی[86] کیا ہے کی آرٹیکل ۲۷ کے تحت جسمانی، ذہنی، اخلاقی اور سماجی نشوونما کے لیے ضروری معیار کے مطابق زندگی پانا بچے کا حق ہے۔ آرٹیکل ۳[۱] کے تحت عدالتیں، انتظامی اور قانون ساز ادارے پابند ہے کہ ان معاملات میں بچے کی "زیادہ فائدے[87]" کو اولین ترجیح بنائیں۔ بچے کی فلاح میں مادی، جسمانی، تعلیمی اور ایموشنل ضروریات شامل ہیں۔ معیاری تعلیم تک رسائی بچے کی فلاح میں شامل ہے۔

---

[84] Maintenance in this Chapter includes food, raiment and lodging"

[85] Convention on the Rights of Child, 1989.

[86] Ratify

[87] Best Interest

معزز عدالت الطاف الدین بنام پروین اختر کیس کو زیر بحث لاتی ہے جس میں قرار دیا گیا تھا کہ لفظ نفقہ کی تشریح کرتے وقت معقول معیار اپنانا ضروری ہوتا ہے لامحدود ہائر لیول کی تعلیم نان و نفقہ کی تعریف میں نہیں آسکتا۔اس ضمن میں خاندان کے سٹیٹس اور دوسرے حالات کو مد نظر رکھنا ہوتا ہے۔

معزز عدالت موجودہ کیس میں بھی الطاف الدین کیس میں طے شدہ اصول کو اپناتے ہوئے قرار دیتی ہے کہ اگرچہ بچے کی لامحدود ہائر لیول تک تعلیم تعلیمی اخراجات برداشت کرنے کا باپ پابند نہیں تاہم وہ بچے کی گریجویشن سٹڈیز کی تکمیل اور نوکری پانے تک نان و نفقہ دینے کا پابند ہے۔اس کو مد نظر رکھ کر مذکورہ ماہانہ ۲۵ ہزار روپے زیادہ نہیں ہے کیوں کہ پنشن کے علاوہ بھی درخواست گزار کے ذرائع آمدن موجود ہے پس وہ بیٹی کی تعلیمی اخراجات برداشت کر سکتا ہے۔

مندرجہ بالا وجوہات کی بناپر درخواست گزار کی درخواست خارج کی گئی۔

بچے کے نان نفقہ میں سالانہ اضافے کا اطلاق بچے کی پیدائش ہوگا یا ڈگری پاس ہونے کے دن سے ہوگا، اس نکتہ پر لاہور ہائی کورٹ کا اہم فیصلہ[88]

طاہر خان وزیر[89]

کیس کے حقائق :

اس فیصلے کیس کے مختصر حقائق یہ ہے کہ بچی کے حق میں نفقے کی ڈگری سالانہ ۱۵فیصد اضافے کے ساتھ پاس ہوتی ہے۔ نان و نفقہ میں سالانہ اضافے کا اطلاق کب سے ہوگا اس بارے میں ججمنٹ میں واضح زکر نہیں تھا۔ ایگزیکٹیوٹنگ کورٹ قرار دیتی ہے کہ اضافے کا اطلاق بچے کی پیدائش کے دن سے ہوگا۔ ڈسٹرکٹ کورٹ اس کے خلاف فیصلہ دیتے ہوئے قرار دیتی ہے کہ

[88]اس فیصلے کے مصنف جج جسٹس انوار حسین اوراسے[رٹ پٹیشن نمبر ۸۷۸۶آف۲۰۲۱] یا"سامیہ زمان بنام اسد زمان وغیرہ "کے طور پر تلاش کیا جاسکتا ہے۔

[89]ایڈوکیٹ و ممبر ٹیم آئین قانون

اضافے کا اطلاق بچے کی جنم دن سے نہیں بل کہ جس دن فیصلہ ہوا اس دن سے ہوگا۔ اس کے بعد معاملہ ہائی کورٹ میں جاتا ہے۔

عدالت کے سامنے بنیادی سوال:

- نان و نفقے ڈگری میں سالانہ اضافے کا اطلاق بچے کی پیدائش یا فیصلہ کے دن سے ہوگا؟

معزز عدالت مجموعہ ضابطہ دیوانی کے دفعہ ۲[۹] میں ججمنٹ ، دفعہ ۲[۲] میں ڈگری، دفعہ ۲[۱۴] میں آرڈر، آرڈر ۲۰ رول ۴ میں ججمنٹ کے اجزاء، آرڈر ۴۱ رول ۳۱ میں اپیلیٹ کورٹ کی ججمنٹ کے ضروری اجزاء کو دیکھتے ہوئے یہ خلاصہ نکالتی ہے کہ ایک ججمنٹ/آرڈر کے لیے ضروری ہے کہ اس میں مختصر اور جامع حقائق پر مبنی بیان، تعین طلب نکات، ہر نکتہ پر فریقین کے دلائل اور فیصلے کے وجوہات ہو۔

اس کے بعد عدالت آرڈر/ججمنٹ/ڈگری کے اطلاق کے حوالے سے عدالتی نظائر کو زیر بحث لاتی ہے جس میں یہ قرار دیا گیا ہے کہ ان کا اطلاق مؤثر با مستقبل ہوگا جب تک اس کے مؤثر با ماضی اطلاق کے حوالے سے واضح حکم نہ ہو۔

مندرجہ بالا پوزیشن واضح کرنے کی بعد عدالت موجودہ کیس کی طرف واپس آتی ہے جس میں بچے کے حق میں نان و نفقہ کی ڈگری تو پاس ہوئی ہے لیکن سالانہ پندرہ فیصد اضافے کے اطلاق سے متعلق تاریخ کا نہیں بتاتا گیا ہے۔ یعنی یہ ۱۵ فیصد اضافے کا اطلاق کب سے ہوگا اس کا تعین ممکن نہیں ہے۔ عدالت فیملی کورٹس ایکٹ ۱۹۶۴ دفعہ۱۷[اے][۳] کا زکر کرتی ہے جو کہتا ہے کہ فیملی کورٹ جہاں سالانہ اضافے کا واضح طور پر حکم نہ جاری کیا جایے اس کیس میں نفقے میں خود بخود سالانہ ۱۰فیصد اضافہ سمجھا جائے گا۔

فیصلہ:

عدالت قرار دیتی ہے کہ مندرجہ بالا عدالتی نظائر اور قانون سے معلوم ہوتا ہے کہ نان و نفقہ کی ڈگری پاس کرتے وقت عدالت پہ لازم ہے کہ نفقے میں سالانہ اضافے کا واضح حکم بھی کرے، تاھم اگر اس اضافے کا اطلاق مؤثر با ماضی مقصود ہو تو عدالت ثبوتوں کی بنا پر کرے گی، اگر کوئی مخصوص تاریخ نہ دیا جایے تو سالانہ اضافے کا اطلاق فیصلے کے دن سے ہوگا۔

ان وجوہات کی بنا پر عدالت نے ڈسٹرکٹ کورٹ کا فیصلہ [نان و نفقہ میں سالانہ اضافہ ڈگری کے دن سے اطلاق] برقرار رکھا۔

پاکستان میں قانون کی تعلیم: ۵ سالہ اور ۳ سالہ ایل ایل۔بی کا ایک موازنہ

ڈاکٹر عزیز الرحمان
ڈائریکٹر، قائداعظم سکول آف لاء

پاکستان میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے رجحان میں ایک غیر معمولی اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے۔ ملک بھر کی پبلک سیکٹر جامعات میں اس وقت ایل ایل بی کا پروگرام ان پروگرامز میں سرفہرست ہے جن میں داخلے کے لئے سب سے زیادہ درخواستیں موصول ہوتی ہیں۔ سپریم کورٹ کے ۲۰۱۸ میں کئے گئے ایک فیصلے کے بعد ملک بھر میں یونیورسٹیاں اور ان سے ملحقہ پرائیویٹ لاء کالجز پانچ سالہ ایل ایل بی کا پروگرام چلا رہے ہیں اور اتنی طویل مدت ہونے کے باوجود ایل ایل بی میں داخلوں کا رجحان بڑھ رہا ہے۔

پاکستان میں ایل ایل بی کا جو نصاب رائج ہے وہ ہائیر ایجوکیشن کمیشن نے کئی سال قبل پاکستان بار کونسل اور قانون کی تعلیم سے وابستہ ماہرین کی مدد سے تشکیل دیا تھا۔ اس وقت یہ نصاب خاصا پرانا ہو چکا ہے اور اس میں متعدد ناگزیر تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ حالیہ مہینوں میں ہائیر ایجوکیشن کمیشن سے ملک بھر کی جامعات کو نئی انڈر گریجویٹ پالیسی ارسال کی ہے اور اس پالیسی کا اطلاق ایل ایل بی کی ڈگری پر بھی ہوتا ہے۔ اس پالیسی کی روشنی میں بھی پانچ سالہ ایل ایل بی کے نصاب کو از سر نو ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ ایل ایل بی کا موجودہ نصاب سرے سے نصاب کہلانے کا مستحق ہی نہیں ہے۔ کسی بھی اکیڈمک پروگرام کے نصاب کے جو مقاصد ہو سکتے ہیں ان کے حصول کے لئے نصاب میں شامل ہر کورس کی سطح پر ذیلی مقاصد ترتیب دے کر مجموعی ہدف حاصل کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں ایل ایل بی کے نصاب کے مصنفین نے مختلف قوانین کے مندرجات کو ایک ترتیب سے لکھ کر اس پر نصاب کا عنوان قائم کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کسی قانون مثلاً معاہدوں کے قانون، کی ایک خاص ترتیب ہوتی ہے جو سیکشنز کی صورت میں مدون ہو کر سامنے آتی ہے۔ ایل ایل

بی کے نصاب میں شامل اکثر مضامین کے مندرجات مخصوص قانون کے سیکشنز کو محض نقل کر کے بنائے گئے ہیں۔

اس ضمن میں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیئے کہ ایل ایل بی کے نصاب میں کل کتنے مضامین ہونے چاہئیں۔اس وقت پاکستان میں پانچ سالہ ایل ایل بی کا پروگرام کل ۵۶ کورسز پر مشتمل ہے جو سب کے سب ان معنوں میں لازمی ہیں کہ ان ۵۶ کورسز کو پاس کئے بغیر ایل ایل بی ڈگری نہیں مل سکتی۔ان ۵۶ کورسز کے اندر محدود تعداد میں آپشنل کورسز موجود ہیں مگر ایک طالب علم کے لئے مجموعی طور پر ۵۶ کورسز مکمل کرنا ضروری ہے۔اس کا دوسرے الفاظ میں مطلب یہ ہوا کہ ایل ایل کا پروگرام ۵۶ کورسز، ۱۶۶ کریڈٹ آورز اور دس سمسٹرز پر مشتمل ہے۔

اتنے طویل دورانیے اور مضامین سے بھرپور پانچ سالہ ایل ایل بی کے مقابلے میں پاکستان ہی کے اندر ایکسٹرنل ایل ایل بی کے نام پر لندن یونیورسٹی اور بعض دیگر برطانوی جامعات کے تین سالہ ایل ایل بی پروگرامز بھی چل رہے ہیں۔یہ پروگرام ان جامعات کے منظور شدہ ٹیچنگ سینٹرز یا دوسرے الفاظ میں مقامی نجی اسکولوں اور کالجوں کے ذریعے آفر کئے جاتے ہیں اور ان میں مقامی طلباء پاکستان کے اندر رہتے ہوئے ایل ایل بی کی تعلیم صرف تین سالوں میں مکمل کر لیتے ہیں۔کیا آپ کو اندازہ ہے کہ ان تین سالہ ایل ایل بی کے پروگرامز میں طلباء کو کل کتنے مضامین پڑھنا ہوتے ہیں؟۔۱۲، جی ہاں صرف ب ۱۲ جن میں سے چھ کے قریب مضامین لازمی ہوتے ہیں اور باقی ۶ طلباء اپنی مرضی سے منتخب کر سکتے ہیں۔ان ۱۲ مضامین کو ۳ سالوں میں مکمل کیا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر سال ۴ مضامین! اگر ان ۱۲ مضامین میں سے ہر ایک کو ۳ کریڈٹ آورز کے برابر مان لیا جائے تو مجموعی طور یہ یہ ایکسٹرنل ایل ایل بی پروگرام ۳۶ کریڈٹ آورز کے برابر بنتا ہے۔اب آپ خود اندازہ لگا لیں کہ کہاں تین کے مقابلے میں پانچ سالہ پروگرام، کہاں ۳۶ کریڈٹ آورز کے مقابلے میں ۱۶۶ کریڈٹ آورز اور کہاں ۵۶ مضامین کے مقابلے میں ۱۲ مضامین! اتنے تفاوت کے باوجود پاکستان بار کونسل نے پاکستان کے اندر ہی پڑھائے جانے والے تین سالہ ایکسٹرنل ایل ایل بی کے پروگرام کو بالکل اسی طرح منظور کر رکھا ہے جس طرح مقامی پانچ سالہ ایل ایل بی کو منظور کیا جاتا ہے۔بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مقامی ایل ایل بی کے پروگرام چلانے والے اداروں پر بار کونسل نے اپنے رولز کی تمام شقوں مثلاً طلباء کی تعداد، دس کلاس رومز، لائبریری و کتب کی تعداد، کمپیوٹر لیب، مستقل اساتذہ وغیرہ کو بجا طور پر لازمی کر رکھا ہے۔اس کے برعکس ایکسٹرنل پروگرام چلانے والے اداروں کی اکثریت کے ہاں مستقل فیکلٹی ممبرز سمیت دیگر کئی شرائط سرے سے مفقود ہی ہوتی ہیں۔

ان دو پروگرامز کے درمیان اس تفاوت کے نتیجے میں ایک ایسا امتیازی سلوک پر مبنی صورتحال پیدا ہو گئی ہے جس کا شکار پانچ سالہ ایل ایل بی پروگرام میں داخلہ لینے والے طلباء ہو رہے ہیں۔ یہ تقسیم دراصل ایک کلاس کلچر کی پیداوار ہے کہ وہ طلباء جو بھاری فیسیں دے کر ایکسٹرنل پروگرام میں داخل ہو جاتے ہیں وہ کم مدت میں اور کم پڑھ کر مقامی پروگرام کے طلباء کی نسبت جلد پریکٹس میں داخل ہو جاتے ہیں۔ دو سالوں کو یہ فرق معمولی فرق نہیں ہے کہ ایک ہی عمر کے دو طلباء میں سے جو طالب علم تین سالہ پروگرام کرتا ہے وہ پریکٹس کر کے جب ہائی کورٹ کے لائسنس کا حقدار بنے گا اس وقت اس کے ساتھ کا پانچ سالہ ایل ایل بی کرنے والا طالب علم اپنی پریکٹس کا آغاز کرے گا۔

بدقسمتی سے یہ امتیازی صورتحال ملک میں قانون کی تعلیم کو ریگولیٹ کرنے والے ادارے کے رولز سے سامنے آئی ہے۔ انہی رولز کی روشنی میں سپریم کورٹ کے ۲۰۱۸ کے فیصلے کی بھی یہی تعبیر کی جاتی ہے کہ فارن ڈگری کے مفہوم میں مقامی طور پر حاصل کی گئی فارن ڈگری بھی شامل ہے جو کم از کم میری دانست میں ایک بالکل لغو تعبیر اور فہم ہے۔ اگر ایک پاکستانی طالب علم انگلینڈ جا کر وہاں کی کسی یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگری تین سالوں میں حاصل کر کے واپس پاکستان آئے تو اس کی ڈگری کو پریکٹس کے لائسنس کے لئے تسلیم کرنے کی حد تک تو بات سمجھ میں آتی ہے مگر اس کا یہ مفہوم کشید کرنا کہ تین سالہ غیر ملکی ایل ایل بی پروگرامز کو ملک بھر کے ہر شہر اور گلی کوچے میں مہنگے داموں فروخت کیا جائے اور ان مقامی چربہ پروگرامز کو بھی اسی طرح معتبر مانا جائے جس طرح ۵ سالہ ایل ایل بی کو مانا جاتا ہے تو یہ محض اشرافیہ کا اپنے بچوں کے لئے چور دروازہ کھولنے کے مترادف ہے۔

پاکستان میں قانون کی تعلیم کے میدان میں متعدد اصلاحات کی ضرورت ہے اور اس ضمن میں سب سے اہم اور فوری ضرورت جس چیز کی ہے وہ اس امتیازی سسٹم کے خاتمے کے بارے میں کوششوں کی ہے۔ اگر ہم اتنے بے بس اور لاچار ہیں کہ تین سالہ ایکسٹرنل پروگرامز کو کسی فریم ورک میں لا کر ملکی قوانین پر مشتمل ایا ۲ سالہ لازمی ڈپلوما کے ساتھ مشروط نہیں کر سکتے تو کم از کم اپنے طلباء کو پ ۵ سال کے طویل پروگرام سے تو بچا سکتے ہیں۔ ملک بھر کے قانون کے اساتذہ کو سر جوڑ کر بیٹھنے کی ضرورت ہے کہ کس طرح ہم ۵ سالہ ایل ایل بی کو ۴ سالہ پروگرام میں بدل سکتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے ۵۶ کورسز کو ایل ایل بی میں پڑھانے کی توجیہہ نہیں کی جا سکتی کہ اتنی بڑی تعداد میں کورسز پڑھانے کے بعد بھی طلباء کی استعداد پر سوالات اٹھائے جاتے ہیں۔